ہفت روزہ

خدام الدین

لاہور
پاکستان

16/35

بانی

شیخ التفسیر

حضرت مولانا احمد علی رحمۃ اللہ علیہ

مدیر مسئول

مولانا عبید اللہ انور
امیر انجمن خدام الدین لاہور

مدیر اعلیٰ

مجاہد الحسینی

یکم ذی الحجہ ۱۳۹۰ھ ۲۹ جنوری ۱۹۷۱ء

ہدیہ ۳۵ پیسے

احادیث الرسول صلی اللہ علیہ وسلم

عن ابی سعید بن المعلّی رضی اللہ عنہ قال: قال لی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم "الا اعلمک اعظم سورۃ فی القرآن قبل ان تخرج من المسجد؟ فاخذ بیدی فلما اردنا ان نخرج قلت یا رسول اللہ انک قلت لاعلمنک اعظم سورۃ فی القرآن؟ قال: الحمد للہ رب العالمین ہی السبع المثانی والقرآن العظیم الذی اوتیتہ" (رواہ البخاری)

ترجمہ: حضرت ابو سعید رافع بن المعلّی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے ارشاد فرمایا کہ کیا میں تجھ کو مسجد سے نکلنے سے پہلے قرآن کریم کی سب سے بڑی سورت نہ بتلاؤں؟ پھر آپ نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ پھر جب ہم نے مسجد سے باہر نکلنے کا ارادہ کیا تو میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! آپ نے فرمایا تھا کہ میں تجھ کو قرآن کی سب سے بڑی سورت بتاؤں گا۔ آپ نے فرمایا وہ "الحمد للہ رب العالمین" ہے اور یہ سات آیتیں ہیں (جو نماز میں) بار بار پڑھی جاتی ہیں ـــــ اور قرآن عظیم ہے جو مجھ کو دیا گیا ہے۔

عن ابی سعید الخدری رضی اللہ عنہ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال فی قراءۃ قل ہو اللہ احد ـــ "والذی نفسی بیدہ انہا لتعدل ثلث القرآن" وفی روایۃ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال لاصحابہ ایعجز احدکم ان یقرأ ثلث القرآن فی لیلۃ؟ فشق ذلک علیہم وقالوا ایّنا یطیق ذلک یا رسول اللہ؟ فقال: قل ہو اللہ احد، اللہ الصمد، ثلث القرآن" (رواہ البخاری)

ترجمہ: حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے "قل ہو اللہ احد" کے پڑھنے کے بارے میں ارشاد فرمایا ہے کہ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے یقیناً یہ سورت ایک تہائی قرآن کے برابر ہے۔ اور ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب سے فرمایا کہ کیا تم میں سے کوئی شخص اس بات سے عاجز ہے کہ ایک رات میں تہائی قرآن پڑھ لے؟ تو صحابہ کرام کو یہ بات شاق معلوم ہوئی اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ! کون اس چیز کی طاقت رکھتا ہے؟ تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ "قل ہو اللہ احد، اللہ الصمد" تہائی قرآن کے برابر ہے۔

عنہ ان رجلا سمع رجلا یقرأ "قل ہو اللہ احد" یرددہا فلما اصبح جاء الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فذکر ذلک لہ وکان الرجل یتقالّہا فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم "والذی نفسی بیدہ انہا لتعدل ثلث القرآن" (رواہ البخاری)

ترجمہ: حضرت ابو سعید خدری ہی سے روایت ہے کہ ایک شخص نے ایک شخص کو "قل ہو اللہ احد" پڑھتے ہوئے سنا اور وہ شخص اس کو بار بار پڑھتا تھا۔ جب صبح ہوئی تو وہ شخص حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپ سے یہ چیز بیان کی اور وہ آدمی اس کو قلیل سمجھ رہا تھا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے کہ یہ سورت تہائی قرآن کے برابر ہے۔

عن ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال فی قل ہو اللہ احد "انہا تعدل ثلث القرآن" (رواہ مسلم)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سورت "قل ہو اللہ احد" کے بارے میں ارشاد فرمایا کہ یہ (سورت) تہائی قرآن کے برابر ہے۔

عن انس رضی اللہ عنہ ان رجلا قال: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انی احب ہذہ السورۃ قل ہو اللہ احد، قال: حبک ایاہا ادخلک الجنۃ (رواہ الترمذی وقال [illegible] ورواہ البخاری فی صحیحہ تعلیقاً)

حضرت انس رضی اللہ عنہ [illegible] کرتے ہیں کہ ایک شخص نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں اس سورت قل ہو اللہ احد کو محبوب رکھتا ہوں۔ آپ نے ارشاد فرمایا اس کو محبوب رکھنا تجھ کو جنت میں داخل کر دے گا۔ ترمذی نے اس حدیث کو روایت کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث [illegible] اور امام بخاری نے اپنی صحیح میں اس کو تعلیقاً بیان کیا ہے۔

عن عقبۃ بن عامر رضی اللہ عنہ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال: "الم تر آیات انزلت ہذہ اللیلۃ لم یر مثلہن قط؟ قل اعوذ برب الفلق وقل اعوذ برب الناس" (رواہ مسلم)

ترجمہ: حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ کیا تم کو معلوم نہیں کہ آج رات چند آیات ایسی نازل ہوئی ہیں جن کی نظیر اس سے پہلے نہیں دیکھی۔ یعنی قل اعوذ برب الفلق اور قل اعوذ برب الناس۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خدام الدین لاہور

یکم ذی الحجہ ۱۳۹۰ھ
۲۹ جنوری ۱۹۷۱ء

جلد ۱۶
شمارہ ۲۵

فون نمبر ۶۷۵۴۵

مندرجات

نگرانِ اعلیٰ
حضرت مولانا عبید اللہ انور

مدیر اعلیٰ
مجاہد الحسینی

عبدالغفار خاںؒ کے تازہ ارشادات

پاکستان کا دستوری مرحلہ ——— اور نظامِ خلافتِ راشدہ کا مطالبہ!

نمائندہ مشرق مقیم جلال آباد کے حوالہ سے روزنامہ مشرق لاہور ۱۶ر جنوری ۱۹۷۱ء نے سرخپوش رہنما جناب عبدالغفار خاں کا خصوصی بیان شائع کیا ہے جس میں انہوں نے کہا ہے کہ:

"پاکستان میں اسلامی حکومت قائم ہو اور جو آئین تیار کیا جائے اس کی بنیاد خلفائے راشدینؓ کے نظام پر رکھی جائے۔ کیونکہ اس کے بعد ہمیں کسی دوسرے نظام کو اپنانے کی ضرورت باقی نہیں رہے گی۔"

خان عبدالغفار خاں نے پاکستان کے مختلف شہروں میں تشدد کے واقعات پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا:-

"ہنگامہ آرائیاں اور توڑ پھوڑ کے واقعات پاکستان کے امن پسند لوگوں کے لئے شرم کا باعث ہیں۔ ہمیں یہ ہنگامہ آرائیاں ختم کرکے تعمیری کاموں میں حصہ لینا چاہیئے اور عوام کی معاشی اور معاشرتی اصلاح پر توجہ دینی چاہیئے۔ عوام سادگی اختیار کریں۔ فرسودہ رسومات کو ترک کر دیں، بے جا اسراف سے گریز کریں، اور ملک کے لئے محنت اور تندہی سے کام کریں تو وہ دن دور نہیں جب پاکستان دنیا کے ترقی یافتہ ملکوں کی صف میں شامل ہو جائے گا۔"

سرخپوش رہنما خان عبدالغفار خاں ایک منجھے ہوئے سیاست دان، تحریکِ آزادیٔ وطن کے ممتاز رہنما اور پختون عوام کے محبوب قائد ہیں، انہوں نے تحریک آزادی اور اپنے صوبہ کے عوام کے لئے بڑی قربانیاں دی ہیں اور زندگی کا بیشتر حصہ قید و بند کی صعوبتوں اور مصیبتوں کی نذر کیا ہے۔ ایسے تجربہ کار اور دور اندیش مسلم رہنما نے ٹھیک ایسے موقع پر جب کہ پاکستان کا دستور ترتیب و تدوین کے مراحل طے کر رہا ہے نہایت صائب مشورہ دیا ہے اور صحیح رہنمائی کی ہے کہ پاکستان کا آئین خلافتِ راشدہ کے نظام کی روشنی میں تیار کیا جائے۔

خان عبدالغفار خاں کے علاوہ پاکستان کے تمام سیاسی اور مذہبی رہنما بھی یہی اعلان کرتے رہے ہیں کہ پاکستان کا نظامِ حکومت خلافتِ راشدہ کی بنیاد پر قائم کیا جائے گا۔

سوال یہ ہے کہ اسلام کا یہ مقدس نظام رائج کب ہوگا؟ اگر موجودہ آئین ساز اسمبلی نے پاکستان کا مقصدِ وجود اور عوام کے اسلامی جذبات و احساسات کو نظرانداز کرکے کوئی غیر اسلامی دستور مرتب کرنے کی کوشش کی۔ یا اراکین اسمبلی نے اسلام کے صحیح نظام خلافتِ راشدہ کو نظرانداز کر دیا تو اس کے ملّی اور ملکی اثرات نہایت ہی خطرناک اور ہلاکت آفریں ہوں گے۔ دستور سازوں کو اس کی سنگینی کا احساس ہرگز فراموش نہ کرنا چاہیئے۔

سرخپوش رہنما جناب عبدالغفار خاں نے اپنے بیان میں اگرچہ اپنا ملکی اور ملّی فریضہ ادا کرنے کی بھرپور کوشش فرمائی ہے اور ملکی عوام کو ان کے جذبات کی قدر کرنی چاہیئے۔ عبدالولی خاں نے بھی اگرچہ اپنے صوبہ کے سیاسی معرکوں میں اچھی خدمات انجام دی ہیں لیکن انہوں نے حالیہ انتخابات میں علماءِ اسلام اور دینی رہنماؤں کے خلاف زہریلے اور دشنام آلود بیان دے کر فضا کو مکدّر کرنے کی جو کوشش فرمائی اور اس سلسلہ میں اپنے اخبار "شہباز پشاور" میں مسلسل مضامین کے ذریعہ علماءکرام خصوصاً جمعیۃ علماءِ اسلام کو انگریز کا آلۂ کار ثابت کرنے کے لئے جو طرزِ عمل اختیار کیا ہے وہ حد درجہ افسوسناک ہے۔ ولی خاں کو نیپ کے ذہن سے نہیں اپنے ذہن سے سوچنا چاہیئے اور کم از کم اپنے والد بزرگوار ہی کے

افکار و نظریات کو اپنانے کی کوشش کرنی چاہیئے۔

ہمارا خیال ہے کہ ولی خاں اپنے حالیہ دورہ میں جبکہ وہ علاج کے لئے افغانستان جارہے ہیں۔ وہاں اپنے والد بزرگوار سے ملاقات کے بعد اپنے افکار و نظریات اور طرزِ عمل میں ضرور تبدیلی واقع کریں گے اور اس بات کی عملاً کوشش کریں گے کہ پاکستان میں خلافتِ راشدہ کی اساس پر عادلانہ اور منصفانہ نظامِ حکومت رائج کیا جائے۔

جنّت کی ایک سیٹ

برطانیہ میں شائع ہونے والی یہودی مصنف کی گستاخانہ کتاب "برٹش آرٹ آف لو اِن پکچرز" کے خلاف زبردست مظاہرہ کرنے والے طلبہ میں سے دیال سنگھ کالج کے طلبہ کا اپنا عمل و کردار کیا ہے؟ اور وہ خود اسلامی شعائر کا کس قدر مذاق اڑاتے ہیں اور اسلامی قدروں کی توہین کرتے ہیں۔ اس کا اندازہ معاصر روزنامہ مشرق لاہور (۱۱ر جنوری ۱۹۷۱ء) کے اس اداریی نوٹ سے لگایا جا سکتا ہے۔ جس میں "ایک سوال" کے عنوان سے لکھا گیا ہے:۔

ایک سوال

دیال سنگھ کالج میں طلبہ کا ایک مباحثہ منعقد ہوا جس کا عنوان تھا "جنت میں ایک سیٹ خالی ہے۔ اس کا حقدار کون ہے؟ ہیر، ہٹلر یا غالب"۔ اس موضوع پر مباحثہ میں حصہ لینے والے طلبہ نے کیا دلائل پیش کئے اور ایوان نے کیا فیصلہ دیا۔ ہم اس کی تفصیلات میں جانا نہیں چاہتے صرف کالج کے پرنسپل صاحب جنہوں نے اس مباحثہ کی صدارت کے فرائض انجام دیے اور دوسرے اہل علم حضرات اور علماء کرام کی توجہ اس بات کی طرف مبذول کرانا چاہتے ہیں کہ قرآن نے جنت کا جو تصور پیش کیا ہے اور جنت کے حقداروں کی جو صفات بیان کی ہیں کیا ان کے پیشِ نظر ایک مسلم معاشرے میں اس قسم کی بحث کی کوئی گنجائش موجود ہے؟

ہمارے نزدیک یہ محض ایک جذباتی مسئلہ نہیں ہے۔ پڑھے لکھے لوگوں کو اس بات پر سنجیدگی سے غور کرنا چاہیئے کہ یورپ میں اسلام کے دشمن عیسائی اور یہودی مفکروں، مصنفوں، ناشروں نے اسلام کو بدنام کرنے کے لئے وقتاً فوقتاً جو شرمناک حرکتیں کی ہیں ان میں یہ بات بھی نمایاں اہمیت رکھتی ہے کہ وہ اسلامی معاشرے کی بعض چیزوں اور اصطلاحات کا مذاق اڑاتے ہیں۔ اس مقصد کے لئے ان دریدہ دہنوں نے مکہ، حرم، جنت، "پروفٹ" یعنی رسول اور پیغامبر جیسے الفاظ کو ہر نامناسب اور ناروا مفہوم کے لئے محاوروں کے طور پر اپنی زبانوں میں رائج کیا ہے۔ اس کے بعد انہوں نے مشاہیر اسلام کے ناموں کا مذاق اڑانا شروع کیا اور دنیا بھر کی قبیح چیزوں کو مسلمانوں سے وابستہ کرنے کے لئے ان پر ایسٹرن، ٹرکش اور ایجپشن کے کے لیبل لگائے۔ اسلام اور مسلمانوں نے ناپسندیدہ چیزوں کو وابستہ کرنے کی یہ تحریک کسی نہ کسی شکل میں مسلسل جاری رہتی ہے اور جب ہم خود جنت پر ہٹلر کے حقدار ہونے کی بحث میں حصہ لیتے ہیں تو کیا غیر شعوری طور پر اسلامی اصطلاحات اور تصورات کا مذاق اڑانے کی اس تحریک کا شکار نہیں ہو جاتے؟

طلبہ کو چاہیئے کہ وہ اپنے طرزِ عمل سے اس بات کا ثبوت مہیا نہ کریں جس سے غیر مسلموں کے حوصلے اس حد تک بلند ہو جائیں کہ وہ محسنِ انسانیت اور رحمتِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس کے علاوہ تمام اسلامی شعائر کی توہین و تذلیل کی جسارت کرنے لگیں۔

طنز و مزاح کے عنوان کے لئے "دیال سنگھ کالج" کے طلبہ مشرقی پنجاب کا پورا علاقہ موضوع مذاکرہ بنا سکتے ہیں۔ لیکن "بازی بازی با ریش بابا ہم بازی" کا مصداق نہ بننا چاہیے۔

سود خور عورت کو عذابِ قبر

ایک وحشت ناک خبر ہے کہ:۔

"گوجرانوالہ کے نواحی گاؤں آدھورایئں کے قبرستان میں ایک قبر سے اچانک آگ کے شعلے اٹھتے ہوئے دکھائی دیئے چشم زدن میں یہ شعلے آسمان سے باتیں کرنے لگے۔ دریں اثنا قبرستان کے قریبی کنوئیں کے مالک محمد عظیم نے گاؤں کے امام مسجد اور دیگر معززین کو تمام حالات سے آگاہ کیا۔ یہ لوگ قبرستان میں پہنچ گئے اور قرآن شریف کی تلاوت کرنے لگے، اور آگ آہستہ آہستہ ختم ہوگئی۔ گاؤں کے ایک شخص نے بتایا کہ یہ قبر سودی کاروبار کرنے والی ایک عورت کی ہے جو کچھ عرصہ قبل وفات کے بعد یہاں دفن کی گئی تھی"

گناہگار انسانوں کے لئے "عذابِ قبر" کا ذکر مختلف احادیثِ نبوی میں آیا ہے۔ پیغمبر آخرالزمان صلی اللہ علیہ وسلم نے عذابِ قبر سے بچنے کے لئے نیک اعمال کی تاکید فرمائی ہے۔

آپ نے ان گناہوں کی تفصیل بھی بیان فرمائی ہے جن کے ارتکاب پر عذابِ قبر کی سزا دی جاتی ہے۔ ان میں سے ایک معمولی گناہ جس کا ارتکاب آج ہماری سوسائٹی کا فیشن بن گیا ہے وہ پیشاب کے چھینٹوں سے پرہیز کرنا ہے۔ حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کھڑے ہو کر پیشاب کرنے اور اپنے کپڑوں کو پیشاب کے چھینٹوں

سے بچانے کی سخت تاکید کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ بسا اوقات عذابِ قبر اس وجہ سے بھی ہو جاتا ہے۔

جہاں تک سود خوری کا تعلق ہے ہمارا پورا نظامِ معیشت سود پر مبنی ہے اور کوئی شخص دعویٰ نہیں کر سکتا کہ کسی نہ کسی طریق سے اس کا دامن سودی کاروبار یا سود خوروں کے ساتھ لین دین اور تجارتی تعلقات سے بالکل پاک ہے۔

ایسے معاشرے کو سود سے جتنا ممکن ہے چھٹکارا حاصل کر لینا چاہیئے۔ دنیا کے بہت سے ملک جن میں روس، چین اور گھانا شامل ہیں سودی نظام کے بغیر کاروبارِ حکومت چلا رہے ہیں اور ہم تو خدا کے فضل و کرم سے مسلمان ہیں۔

ان دنوں جبکہ ملک کا دستوری مرحلہ طے ہو رہا ہے اور انتخابات میں کامیاب ہونے والی جماعتیں پاکستان کا اقتصادی اور معاشی ڈھانچہ نئے سرے سے مرتب کرنے کا دعویٰ کر رہی ہیں اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ وہ اسلام کے اصولوں کے مطابق سُود سے پاک اقتصادی و معیشتی نظام مرتب کریں۔ ورنہ وہ یاد رکھیں کہ خداوند قدوس کی گرفت بڑی سخت اور اس کا عذاب بڑا دردناک ہوگا۔

عذابِ قبر کے واقعات ہمارے لئے درسِ عبرت کے طور پر ہیں تاکہ ہم نصیحت حاصل کر کے خدا کے صحیح فرمانبردار بن سکیں۔

قاضی محمد زاہد الحسینی کے ماہانہ دروس القرآن مجید کا پروگرام

- ★ ہر انگریزی ماہ کا پہلا اتوار۔ پشاور گلبار کالونی جامع مسجد۔ صبح دس بجے۔
- ★ ہر انگریزی ماہ کا تیسرا اتوار۔ اسلام آباد مسجد الفلاح صبح دس بجے۔
- ★ ہر انگریزی ماہ کا تیسرا اتوار۔ راولپنڈی صدر ٹیلیگراف کالونی۔ اڑھائی بجے شام
- ★ ہر انگریزی ماہ کے آخری جمعہ۔ تربیلا پوسٹ آفس مسجد بعد از نماز عشاء
- ★ ہر انگریزی ماہ کا آخری اتوار۔ واہ کینٹ ۱۵۔ جامن اسٹریٹ صبح دس بجے۔

مجاہد الحسینی

مولانا سید اسعد مدنی کے ساتھ چند روز

ایک سفرنامہ —— ایک تاریخی سرگزشت

(قسط ۱۷)

◎ مشائخ اور دیگر عظیم شخصیات سے ملاقات
◎ تاثرات و واردات

س: دیوبند کے محدثین میں سے آپ سب سے زیادہ کس سے متاثر ہوئے ——؟

مولانا مدنی: دنیا میں کسی شخصیت سے متاثر ہونے کے جتنے اسباب اور رشتے ہو سکتے ہیں وہ سب اللہ تعالیٰ نے ایک ذاتِ گرامی میں جمع کر دیئے تھے۔

جس کا باپ شیخ الحدیث ہو، دنیائے اسلام کی دینی شخصیت ہو، ممتاز سیاسی رہنما ہو، شیخ طریقت ہو وہ اور کس سے متاثر ہو سکتا ہے؟ ہاں تاثرات کے دوسرے زاویے بھی ہو سکتے ہیں جیسا کہ امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد، ابو حنیفۂ ہند مفتی کفایت اللہ، حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی، شیخ الادب مولانا اعزاز علی، شیخ طریقت مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوری، مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی، امیر شریعت مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور دیگر کئی ممتاز شخصیات ہیں جنہوں نے میرے دل و دماغ پر گہرے اثرات چھوڑے ہیں — اور خود مجاہد اسلام حضرت مولانا عزیر گل صاحب مدظلہ العالی کی ذاتِ گرامی کہ اگر ان کی شخصی عظمت اور مجاہدانہ تاریخی کارناموں اور ملی خدمات کا میرے دل و دماغ پر گہرا اثر قائم نہ ہوتا تو اہتمام سفر کی کیا ضرورت تھی؟ میری نگاہ میں صرف پاکستان کے لئے ہی نہیں پوری دنیائے اسلام کے لئے مولانا عزیر گل مدظلہ کی ذاتِ اقدس عظیم قومی و ملی سرمایہ ہیں۔ انھوں نے تحریک آزادی میں حضرت شیخ الہند کی

خوش خبری

حضرت شیخ التفسیر رحمۃ اللہ علیہ لاہور میں تشریف آوری کے وقت سے لے کر تا دمِ آخر بعد از نماز مغرب تعلیم یافتہ حضرات کو فلسفہ شاہ ولی اللہؒ کی روشنی میں تفسیر قرآن پاک پڑھایا کرتے تھے اور ایسے ہی حضرتؒ کے فرزند اکبر حضرت مولانا حبیب اللہ صاحب مہاجر مکی مدظلہ العالی نے اپنے زمانہ قیام لاہور اور پھر حجاز مقدس میں اس سلسلۂ خیر کو جاری رکھا۔ اور حضرت رحمہم اللہ کے وصال کے بعد حضرتؒ کے فرزند ارجمند الحاج مولانا حافظ حمید اللہؒ نے صبح و شام دونوں وقت اس دار فانی سے رحلت فرمانے تک یہ سلسلہ قائم رکھا اور آج مورخہ ۲۳ر جنوری ۱۹۷۱ء کو حضرت مولانا عبید اللہ صاحب انور مدظلہ العالی نے مدرسہ قاسم العلوم میں بعد از نماز مغرب یہ سلسلہ پھر شروع فرما دیا ہے۔ شائقینِ استفادہ کے لئے سنہری موقعہ ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھائیں۔

نوٹ: داخلہ کے لئے دفتر انجمن خدام الدین سے رجوع فرمائیں۔ جمعرات و جمعۃ المبارک کو تعطیل رہے گی۔

(ناظم مدرسہ قاسم العلوم)

خدمت میں رہ کر اور حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی کی رفاقت میں جو زرّیں خدمات انجام دی ہیں وہ برصغیر پاک و ہند کی تاریخ کا سنہری باب ہیں یہ اور بات ہے کہ ہم عصر حاضر کے تقاضوں کے تحت تحریک آزادی کے ان جاں نثار سپوتوں کو فراموش کر دیں جنہوں نے زندگی کی متاعِ عزیز قربان کر کے آزادی کی منزلِ مراد قریب کی۔

س: مولانا ابوالکلام آزاد اور دوسرے اکابر علماء کی زیارت اور ملاقات کے جو قریبی مواقع آپ کو مہیا ہوئے وہ سعادت شاید کسی دوسرے کو نصیب نہ ہوئی ہو۔ آپ نے ملاقات کے وقت ان سے کیا اثر قبول کیا؟

مولانا مدنی: مولانا ابوالکلام آزاد حضرت والد ماجد کی وجہ سے نہایت شفقت و محبت سے پیش آتے۔ ملاقات کے لئے جو پابندیاں اور قیود دوسروں کے لئے ہوتیں بعض دوسری شخصیات کی طرح میرے لئے استثناء ہوتا۔

مولانا آزاد کی مجلس میں بیٹھ کر یہ احساس پیدا ہوتا کہ علم و عرفان کی ایک آبشار ہے جس کی تیز روی اور مسلسل بہاؤ سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد تکلم فرماتے تو یوں محسوس ہوتا کہ شگوفے پھوٹ رہے اور کلیاں مہک رہی ہیں۔ معلومات کی جامعیت کا یہ عالم کہ علمی اور سیاسی موضوع کی کھلی کتابیں ہیں جن کے ورق خود بخود الٹ رہے ہیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد رحمۃ اللہ علیہ کے علاوہ مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی بھی نہایت شفقت فرماتے۔

جمعیۃ علماء کی مجلس شوریٰ کے اجلاس میں مجھے اپنے ساتھ لے جاتے۔ اس طرح مجلس میں بیٹھ کر بزرگوں کے ارشادات مختلف النوع مسائل کے بارے میں ان کے اندازِ فکر معلوم کرنے کا قیمتی موقع میسّر آتا۔ دیوبند میں مجلس احباب کے نام سے ایک تنظیم قائم تھی۔ دوسرے شہروں کے لوگ بھی اس کے اجلاس میں شرکت کرتے۔ علمی و سیاسی موضوع پر اظہار خیال کا سب کو موقع ملتا۔ مولانا حفظ الرحمٰن اور دیگر اکابر کی نگرانی و سرپرستی میں ہمیں اپنے خیالات و افکار ظاہر کرنے کا موقع ملتا۔ دوسرے ساتھی ایسے معاملات میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیتے لیکن میں اس معاملہ میں بدذوق واقع ہوا ہوں۔ بزرگوں سے اکتسابِ فیض کے اچھے اچھے مواقع ہاتھ سے نکل گئے۔ اب جب کبھی ان کا خیال آتا ہے تو پشیمان ہوتا ہوں۔ جیسا کہ حضرت والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں اکتسابِ فیض کے لئے لاکھوں اللہ کے بندے آئے اور فضل و کمال کے بلند و بالا مینار بن گئے لیکن میرے لئے عجز و انکسار کے سوا کچھ نہ رہا۔ اور میں سمجھتا ہوں یہی لائقِ افتخار سرمایہ ہے۔

حضرت شیخ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کی صحبت میں دوسرے بزرگوں اور احباب کی طرح میں بھی بیٹھتا۔ وہ لوگ اس احساس کے ساتھ فیض پاتے کہ شاید دوبارہ حاضری کا موقع ملے یا نہ۔ لیکن میرے ہاں تو کبھی اس جدائی کا تصور بھی نہ آیا تھا آج جب اس کا احساس ہوتا ہے تو دل بیٹھ جاتا ہے اور دیر تک اس محرومی کے احساس میں مستغرق ہو جاتا ہوں۔ اللہ! ہمارے ساتھ یہ کیسا معاملہ ہوا۔

س: حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کے وصال کے بعد مختلف شخصیات نے تعزیت کے خطوط ارسال کئے ہوں گے ان میں سب سے زیادہ اثر خیز اور رقت انگیز کس کا مکتوب تھا؟

مولانا مدنی: خطوط، قصیدے اور تعزیتی پیغامات تو بہت سے موصول ہوئے اور میں تو ابھی تک ان کے بالاستیعاب مطالعہ سے فارغ نہیں ہوا ہوں لیکن سب سے زیادہ جن خطوط نے میرے دل و دماغ پر وجد آفریں اثرات مرتب کئے ان میں مدینہ منورہ اور مکہ معظمہ کے بعض علماء و شیوخ کے مکاتیب اور قصائد ہیں جن کے بار بار مطالعہ کے بعد بھی ہنوز تشنگی محسوس ہوتی ہے۔ (باقی آئندہ)

سرورِ کائناتؐ کا دشمن

کوئی شیطان زاد ہی ہوگا
ایک قدسی صفات کا دشمن
دشمنِ کائنات ہے صہبا
سرورِ کائناتؐ کا دشمن

ترک مجاہدین کے حالات سن کر شیخ الہندؒ پر وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی

مولانا شاہ عبدالقادر رائپوریؒ سے مولانا ابوالحسن علی ندوی کی پہلی ملاقات

حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ دین وسیاست کی معلومات سے پوری طرح باخبر تھے

جمعہ ہی کو نمازِ عصر کے بعد ہم رائے پور روانہ ہوئے جو شہر سہارنپور سے بیس اکیس میل پر کوہ شوالک کے دامن میں ایک قصبہ ہے اور مولانا شاہ عبدالقادر کی اقامت گاہ ہے۔ لاری سہارنپور سے چل کر بھٹ پر ٹھہر جاتی ہے جو ۱۶ میل پر ایک قصبہ ہے۔ بقیہ ۶ میل کی مسافت ہم نے پیدل طے کی۔ قصبے میں اور راستہ میں ہم کو جا بجا مسلمانوں کی عام تواضع اور احترام کی مثالیں ملتی رہیں۔ ہم رات کو ساڑھے نو بجے خانقاہ میں پہنچے نہر کے کنارے ایک مسجد ہے اس کے پہلو میں تعلیم قرآن کا ایک مدرسہ ہے کچھ آگے بڑھ کر ایک پُر فضا چبوترہ اور اس پر دو دالانوں کا ایک مکان ملا اندر کے دالان میں "طالبین" کی ایک جماعت موجود تھی۔ جس حجرے میں شاہ صاحب آرام فرما رہے تھے ہم داخل ہوئے اور حضرت سے مصافحہ کیا جس غیر معمولی محبت و شفقت اور گرمجوشی کا برتاؤ آپ نے ہم نو واردوں سے کیا اس کو ہم بھول نہیں سکتے فوراً باہر تشریف لے آئے اور کھانا تیار کرنے کا حکم دیا۔ مولانا نعمانی نے ہم دونوں کا تعارف کرایا۔ میں نے اپنی کتاب "سیرت سید احمد شہیدؒ" پیش کی جو نہایت محبت سے قبول فرمائی۔

قارئین کرام کو اس موقع پر یہ بتا دینا بھی ضروری ہے کہ سلسلہ دیوبند کے تمام حضرات کو حضرت سید احمد شہیدؒ سے وہ قلبی تعلق اور رابطہ ہے جو اہل سلسلہ کو اپنے مرشد اور روحانی مورث سے ہو سکتا ہے۔ جن لوگوں کو "سیرت سید احمد شہیدؒ" یا حضرت والد مرحوم کا سفرنامہ (ارمغان احباب) پڑھنے کا اتفاق ہوا ہے وہ اس سے بخوبی واقف ہوں گے۔ لیکن خصوصیت کے ساتھ حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب رائے پوریؒ کو حضرت سیّد صاحب سے والہانہ عقیدت تھی اور مولانا عبدالقادر ان کے خلیفہ اور اپنے بزرگوں کے جانشین ہیں۔ جتنی دیر بھی حضرت سیّد صاحبؒ کا تذکرہ رہا لفظ لفظ سے اس قلبی ارادت اور شیفتگی کا اظہار ہوتا تھا جو بزرگانِ دیوبند کا مشترک سرمایہ ہے۔

حضرت شاہ صاحب اس نواح کے مشہور شیخ و مرشد ہیں جن کے متبعین کا حلقہ وسیع ہے۔ لیکن ہم گمنام دسوائے ایک محترم رفیق مولانا نعمانی کے کہ وہ خدا کے فضل سے ان دینی و علمی حلقوں میں بخوبی روشناس بلکہ اس وسیع اور مبارک علمی اور مذہبی برادری کے ایک فرد خاندان ہیں) مسافروں سے آپ جس محبت و خصوصیت سے ملے اس نے ہم کو متحیر کر دیا۔ اور اخلاق نبوی کا ایک نقشہ سا کھینچ دیا۔ رات گئے ہم لوگ سو گئے۔ سحر کے وقت قریب کے تمام حجرے اور کمرے ذکر اللہ سے گونجنے لگے۔ صبح کی نماز کے بعد متصلاً اندر کے بڑے دالان میں نشست ہوئی جو ساڑھے گیارہ بجے تک قائم رہی۔ یہ مجلس کیا تھی "باغ و بہار" تھی۔ حاضرین دنیا و مافیہا سے بے خبر و ہمہ تن گوش تھے۔ حضرت شاہ صاحب نہایت سادہ اور بے تکلف طریقے پر گفتگو فرماتے رہے۔ اگر اس مجلس کی گفتگو قلمبند ہو جاتی تو وہ بزرگان دیوبند حضرت شاہ صاحبؒ اور ان کے رفقاء کے وجد انگیز واقعات و حالات اور ربع صدی کی اسلامی سیاست اور مجاہدانہ تحریکوں کی تاریخ کا نہایت دلچسپ مرقع ہوتا۔ ہم کو جس چیز نے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ حضرت شاہ صاحب کی سیاسی بصیرت، زمانۂ حال کی فہم و فراست، باخبری اور بالغ نظری تھی جس کی ہمیں اس درجے میں ایک خانقاہ نشین شیخ طریقت سے ہرگز توقع نہ تھی۔ دین و سیاست کے اس صحیح امتزاج جذبۂ جہاد اور ولولۂ عمل نے رائے پور کی اس گمنام نہیں مگر کم نام خانقاہ میں جغبوب اور واحد کی سنوسی خانقاہوں کی جھلک

MEDINA - The Prophet's Mosque Bab Al Salam. المدینة المنورة - الحرم النبوی الشریف باب السلام

پیدا کر دی ہے، ہندوستان کی اسلامی تحریکوں اور سیاسی اداروں اور ہندوستانی مسلمانوں کے ماضی قریب حال اور مستقبل پر ایسی چچی تلی اور معتدل رائیں ہم نے کم علماء اور کمتر مشائخ سے سنی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خانقاہ کی دیوار میں ایک دریچہ ہے جس سے جو کچھ ہو رہا ہے اور جو ماضی قریب میں ہوا ہے اچھی طرح نظر آتا ہے اور اس کے ایک مخفی گوشہ میں ایک ایسا تصویر خانہ ہے جس میں ہمارے سیاسی رہنماؤں کی صورتیں نظر آتی ہیں۔ امید و ناامیدی اور سردی و گرمی کا اجتماع بھی ایسا بہت کم دیکھنے میں آیا ہے۔ جیسا مولانا کے دل میں ہے۔ مولانا نے بار بار فرمایا کہ ہم نے جو کچھ دیکھا اور دیکھ رہے ہیں اس سے ہمارا دل سرد ہو گیا ہے اور طبیعت بجھ گئی ہے۔ پھر فرمایا کہ واقعہ یہی ہے کہ بظاہر مسلمانوں کی ذہنی اور عملی حالت مایوس کن ہے لیکن ہم کو کم سے کم خدا کے سامنے معذرت ہی کا سامان کر لینا چاہیئے اور یہ آیت تلاوت فرمائی۔

وَاِذْ قَالَتْ اُمَّةٌ مِّنْهُمْ لِمَ تَعِظُوْنَ قَوْمًا ۙ اللّٰهُ مُهْلِكُهُمْ اَوْ مُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا ۖ قَالُوْا مَعْذِرَةً اِلٰى رَبِّكُمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ

ترجمہ: اور جب کہ کہا ان میں سے ایک جماعت نے کیوں ایسے لوگوں کو نصیحت کرتے ہو جن کو اللہ ہلاک ہی کرنے والا ہے یا ان کو سخت عذاب دینے والا ہے انہوں نے کہا کہ اللہ کے سامنے معذرت کے لئے اور کچھ اس امید سے بھی کہ شاید وہ ڈریں۔

مولانا اسلامی تحریکوں کے سلسلہ میں حکومت کی سازشوں اور خفیہ ریشہ دوانیوں سے خوب واقف ہیں۔ اور آپ کو مسلمان قائدین اور کارکنوں کی فریب خوردگی کا حال اچھی طرح معلوم ہے۔ وہ ان دینداروں کو جنہوں نے دھوکہ کھایا اور اپنے اخلاص اور بے نظیر قربانیوں کے باوجود انگریزی سیاست کے مقابلہ میں مات کھائی، بڑے مزے سے مجذوبوں کی جماعت کے لقب سے یاد فرماتے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ مولانا نے ان تحریکات کا گہرا مطالعہ کیا ہے اور ان کے حافظہ میں ان کی تمام جزئیات اور تفصیلات محفوظ ہیں، اور ان کے ناکام نتائج اور لغزشوں سے وہ زمانۂ حال کی تحریکوں میں فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

ہندوستان کی سیاسیات اور تحریک خلافت میں حضرت شیخ الہندؒ و دیگر اکابر دیوبند اور علماء کے عملی حصہ لینے کی پوری تاریخ سنائی اور اس سلسلہ میں آپ نے ان معلومات کا اظہار فرمایا جو اس جد و جہد کے مخصوص شرکاء اور حضرت شیخ الہندؒ اور ان کے رفیقوں کے خاص رازدار اصحاب ہی سے معلوم ہو سکتے ہیں۔ آپ نے ذکر فرمایا کہ ہنگامہ بلقان کے زمانے میں علماء اور مشائخ کے دو حصوں میں "الہلال" اور "زمیندار" پڑھے جاتے تھے۔ ایک حضرت شیخ الہندؒ کے ہاں دیوبند میں اور ایک حضرت شاہ عبدالرحیم صاحبؒ کے ہاں رائے پور میں۔ ترک مجاہدین کے حالات جب پڑھے جاتے تھے تو حضرت شیخ الہندؒ پر ایک وجد کی سی کیفیت طاری ہو جاتی تھی، فرمایا کہ ایک مرتبہ "الہلال" کی یہ خبر سنائی گئی کہ ایک مجاہد کی ٹوپی پر یہ جملہ لکھا ہوا تھا "الصوفیا بالموت" حضرت نے جب یہ جملہ سنا تو بے اختیار ہو کر اٹھ کھڑے ہوئے اور خاص کیفیت اور وارفتگی کے عالم میں چل چل کر یہی جملہ دیر تک دہراتے رہے۔ مولانا نے فرمایا کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تحریک خلافت کے عظیم الشان جسم میں روح حضرت شیخ الہندؒ کے جذبے اور للہیت کی ہی تھی۔ حضرت کی وفات کے بعد یہ قالب بے روح رہ گیا اور آخر بھی بے روح جسد بھی نہیں رہا۔

اس موقع پر مولاناؒ نے فرمایا کہ جب حضرت شیخ الہندؒ مالٹا سے تشریف لائے تو میں نے حضرت کی ان تکلیفوں اور قربانیوں کا ذکر کیا جو مالٹا کی اسارت کے دوران ظاہر ہوئیں تو حضرت پر رقت طاری ہو گئی اور نہایت رقت انگیز طریقے پر فرمایا کہ ڈر معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ کو یہ چیزیں قبول نہ ہوں۔ یہ کہہ کر آپ پر ایسی خشیت طاری ہوئی کہ آپ لرزہ براندام ہو گئے جس چارپائی پر آپ تشریف رکھتے تھے۔ وہ ہلنے لگی اور تمام حاضرین متاثر ہوئے۔

سلسلہ گفتگو میں ایک صاحب نے مولانا مودودی کا یہ قول نقل کیا کہ جماعت "دیوبند" ہندوستان میں صالح ترین جماعت ہے لیکن اس میں ایک نقص ہے اور وہ اکابر پرستی کا ہے۔ یہ جماعت حق کو اپنے بزرگوں اور اکابر سے جانچتی ہے (او کما قال) مولانا نے اس پر نہایت پرلطف اور معنی خیز تبسم کے ساتھ مولانا مودودی کے سلامت فہم کی داد دی پھر کچھ گفتگو کے بعد فرمایا کہ مولانا مولوی ابوالاعلیٰ صاحب مودودی نے غلط نہیں کہا مگر ہم نے اپنے بزرگوں اور اکابر کے جو حالات دیکھے ہیں ان کی وجہ سے ہم کو

ان کے ساتھ جو عقیدت اور حسن ظن ہو وہ محل تعجب نہیں۔ اس پر اپنے بزرگوں کے عموماً اور اپنے شیخ حضرت رائے پوری کے خصوصاً چند موثر واقعات سنائے۔ ان میں سے دو تین واقعے جو اس وقت بھی ذہن میں محفوظ ہیں ذکر کئے جاتے ہیں۔

فرمایا کہ ایک مرتبہ مریدین میں سے ایک شخص حاضر ہوا تو حسب معمول اس کے گھر کی خیریت پوچھی اس نے ایک نیازمندانہ اور خوش اعتقاد مرید کے لہجہ میں کہا۔ "حضرت کی برکت سے سب خیریت ہے"۔ تو آپ سخت ناراض ہوئے اور تنبیہ فرمائی کہ آئندہ سے کبھی یہ نہ کہنا جب کبھی کہنا ہو تو یوں کہو کہ "اللہ کے فضل سے سب خیریت ہے"۔ اسی طرح ایک مرتبہ میری زبان سے بھی کچھ اسی طرح کے الفاظ محبت اور جوش عقیدت میں نکل گئے تو فرمایا اس سے مجھے تکلیف ہوئی۔ میں کیا اور میری برکت کیا۔ ہر خیر کو اللہ ہی طرف منسوب کرنا چاہیئے۔ (او کما قال)

فرمایا کہ تشرع اور تقویٰ کا یہ حال تھا کہ ایک مرتبہ میں نے لنگی نذر کی تو آپ نے وہ لے لی اور چپکے چپکے انگلیوں سے اس کے کنارے ٹٹولنے لگے تاکہ یہ معلوم ہو کہ اس میں ریشم تو نہیں ہے۔ پھر وہ غالباً گھر میں عورتوں میں سے کسی کو دے دی، اس لئے کہ میں نے اس کو باہر نہیں دیکھا۔ ایک مرتبہ کچھ دور چل کر پھر لوٹے اور جہاں سے چلے تھے وہیں سے پھر چلنا شروع کیا۔ میں نے سمجھ لیا کہ پہلے بلا لحاظ ترتیب چلے تھے اس لئے پھر اس کو دہرایا۔

حضرت سید صاحبؒ کے رفیقوں میں سے ایک شخص کا حال سنایا کہ کسی حکیم کے پاس علاج اور طبی مشورے کے لئے گئے اور دیر تک ۱۰ اس کا انتظار کرنا پڑا۔ جب ملنے کا وقت قریب آیا تو دیکھا کہ وہ بغداد کی طرف منہ کرکے صلوٰۃ غوثیہ پڑھ رہا ہے۔ آپ یہ دیکھتے ہی وہاں سے بغیر ملے واپس چلے۔ ساتھی نے کہا کہ آپ اتنی دیر تک تو انتظار کرتے رہے اور جب ملنے کا وقت آیا تو آپ نے عجلت فرمائی اور بغیر کام کئے ہوئے واپس جا رہے ہیں۔ فرمایا کہ میں مل سکتا ہوں لیکن سوچتا ہوں کہ ملنے کے بعد آج عشاء کو دعائے قنوت میں کس منہ سے خدا کے سامنے کہوں گا وَ نخلع و نترک من یفجرک۔

فرمایا کہ سید صاحب کے ساتھیوں میں سے ایک صاحب تھے جو سرمہ کی چھوٹی چھوٹی پڑیاں بنا کر فروخت کیا کرتے تھے۔ جب ان کے پاس اتنے پیسے آ جاتے کہ دو وقت کھانے کا انتظام ہو سکتا تو بیچنا بند کر دیتے۔ وہ دن بھر میں ایک پارے سے زیادہ نہیں پڑھتے تھے مگر تمام دن پڑھتے تھے۔

شاہ صاحب نے اپنے مسترشدین اور مریدین کے مجمع میں نہایت درد اور حسرت سے بارہا فرمایا کہ کام کرنے والے لوگ یہاں نہیں آتے یہ بیچارے بس ذکر شغل کے لئے آتے ہیں میں ان کو اللہ کا نام بتا دیتا ہوں۔ اس سے زیادہ نہ وہ کسی چیز کے طالب ہیں نہ متحمل۔ ان حضرات میں جو یہاں تشریف رکھتے ہیں اللہ اللہ کرنے کے سوا اور مراقبے اور تسبیحوں سے زائد کوئی ہمت نہیں۔ پھر فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ و اسلاف امت بھی اگر اسی پر اکتفا کرتے تو اسلام عرب سے آگے نہ بڑھتا۔ بڑے مزے سے فرمایا کہ میں بوڑھا ہو گیا ہوں مجھے بھی آرام و آسائش کی ضرورت ہے یہ لوگ بھی اپنا صرف یہی فرض سمجھتے ہیں اور اس فرض کو ادا کرکے بہت خوش ہوتے ہیں لیکن اگر میں ان سے کچھ کام لوں تو پھر یہ غدر کریں۔

فرمایا کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لوگ دینی کام بھی اپنی خواہش کے مطابق کرنا چاہتے ہیں۔ ذکر و تسبیح آسان کام ہے۔ ان میں جی بھی خوب لگتا ہے۔ اسی لئے لوگ اس کے طالب ہوتے ہیں اور اسی پر اکتفا کرتے ہیں۔ سلسلہ کلام میں ارشاد فرمایا کہ میں اپنے سیاسی احباب سے کہتا ہوں کہ ان خانقاہوں سے اخلاص و للّٰہیت اور سوز و گداز اور اپنی سیاسی فہم و بصیرت کے ساتھ مسلمانوں کی خدمت کرو۔ صحیح راستہ یہی ہے۔

پھر بڑی حسرت سے فرمایا کہ اب خانقاہیں بھی سونی ہوتی جا رہی ہیں۔

جو لوگ روس میں معاشی انقلاب لا سکتے ہیں، قرآن پر عمل کرکے مسلمان اس سے بڑھ کر انقلاب برپا کر سکتے ہیں ——— !

معاشی انقلاب اور اسلام

آج دنیا میں اسلامی اصولوں کی بنیاد پر ہی انقلابات رونما ہو رہے ہیں

مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم

آج کے ترقی یافتہ یورپ کو ہم ایک مصیبت میں مبتلا دیکھتے ہیں یورپ کی جس قدر قومیں جمہوریت پسند ہیں اور مشین کے استعمال سے دنیا پر برتری حاصل کر چکی ہیں۔ اگر ان کی پارلیمنٹ میں محافظین اور لبرل کی اکثریت ہے تو ان قوموں کو خطرناک انقلاب ڈرا رہا ہے۔ ان کی پارلیمنٹ میں کاریگروں کا غلبہ ہو کر رہے گا۔ چونکہ یہ کاریگر اور مزدور ایک طویل زمانہ سے کنزرویٹو اور لبرل کے ظلم کا شکار ہوتے رہے ہیں اس لئے ان سے انتقام کا جذبہ مزدوروں میں پیدا ہونا ضروری ہے۔

یہ بھی یاد رہے کہ جن ملکوں میں مشین پر کام کرنے والے انقلاب پیدا

MEDINA - Prophet's Mosque with four Minerets. المدینة المنورة - الحرم النبوي الشریف بمآذنه الأربع والقبة الخضراء

کریں گے۔ اس وقت اگر ملک کے کاشت کار بھی منظم ہو چکے ہوں تو وہ بھی ان کے ساتھ شامل ہو جائیں گے اس لئے اس انقلاب کا اثر پہلے درجے پر تو نہیں البتہ دوسرے یا تیسرے درجہ پر ہمارے ملک میں بھی آئے گا۔ اگرچہ ہم اس انقلاب کے ضمن میں آج پہلی صف میں کھڑے نہیں ہو سکتے۔ مگر دوسرے یا تیسرے دن ہم پر سب کچھ عائد ہو سکتا ہے جو یورپ کی جمہوریت پسند قوم پر آج وارد ہو گا۔

اس قدر جان لینے کے بعد ہماری رائے میں اب کوئی تذبذب نہیں رہا ہم "مکینکل ازم" کی مخالفت نہیں کر سکتے۔ ورنہ مادی ترقی سے ہمارا ملک محروم ہو جائے گا۔ اور وہ دوسروں کا اچھوت غلام بن کر رہ جائے گا۔ البتہ یورپین قوموں کے لئے جو مصیبت آ رہی ہے اس سے کسی قدر مامون ہیں —— لیکن ایک ایسے انسان کے لئے جو مذہبی جماعتوں کی نمائندگی کرتا ہے یہی مصیبت ایک اور راستہ سے آتی ہے۔ سائنس کی ترقی کے ساتھ مذہبی قانون تو الگ رہا سرے سے خدا کا انکار بھی عام طور پر ضروری ہو گیا ہے۔ میں چونکہ مذہب کو نہیں چھوڑ سکتا اس لئے اس مشکل کا علاج برابر سوچتا رہا ہوں۔ مجھے اس سلسلہ میں وحدت الوجود کے سوا اور کوئی ذریعہ نہیں ملا جس سے کہ ایک سائنس دان کو خدا کے وجود کا یقین دلایا جا سکے۔

(اس سلسلہ میں ایک دفعہ حضرت مولانا مرحوم نے اپنی گذشتہ زندگی کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:)

جوانی کا ذکر ہے کہ ہمارا چند عقائد پر یقین تھا۔ ہم نے اپنے عقائد پر نئی زندگی بنانے کی سعی کی ہم سمجھتے تھے کہ ہندوستان سے انگریز کو نکال کر یہاں اسلامی حکومت بنانی ضروری ہے اس کے لئے ہم نے بڑی جد و جہد کی، وطن سے بے وطن ہوئے، افغانستان میں ۷ برس تک اس کے لئے جتن کئے۔ امان اللہ خاں کو انگریزوں سے بھڑایا اور آخر جب دیکھا کہ یہ سب تدبیریں ناکام ہو گئی ہیں اور امان اللہ انگریزوں سے صلح کرنے پر مجبور ہے تو ہم نے افغانستان کو خدا حافظ کہا۔

یہ زمانہ میرے لئے انتہائی کش مکش کا زمانہ تھا۔ مکمل شکست کے بعد ظاہر ہے ان عقائد پر میرا کیسے یقین رہ سکتا۔ میں بالکل مایوس ہونے کے قریب تھا۔ اور اس وقت کوئی عقیدہ یا امید ایسی نظر نہیں آتی تھی کہ اس کی ڈھارس بندھے۔ بیس بائیس برس کی کوششوں کا حاصل پوری ناکامی کی شکل میں سامنے تھا۔ یہ اضطراب، پریشانی اور مایوسی کی حالت معلوم نہیں ایک ہفتہ رہی یا چند ماہ رہی۔ بہر حال میں جب افغانستان سے روس کی طرف چلا ہوں اور راستہ میں نئی زندگی کے آثار نظروں کے سامنے آتے گئے۔ تو میں آہستہ آہستہ شک اور مایوسی کے اندھیروں میں روشنی دیکھنے لگا مجھے ماسکو پہنچتے ہیں دو تین ماہ لگے — راستہ خراب تھا اور سواری کا خاطر خواہ انتظام نہ تھا ہمیں بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ سفر کی ان کلفتوں کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ ذہنی پریشانیوں نے زیادہ بے چین نہ کیا۔ دن رات سفر کی الجھنوں میں بہت کم فرصت ہوتی کہ دماغ کو پریشانیوں میں جان کھپانے کا موقع ملتا، روس کو دیکھ کر اور روسی انقلابیوں کو نئی دنیا کی تعمیر میں مردانہ وار مصروف عمل پا کر مجھے اسلام، اس کی تاریخ اور تعلیمات میں روشنی کی ایک نئی کرن نظر آئی اور مجھے اس حقیقت کا علم ہوا کہ جو انقلاب آج روس میں ہو رہا ہے وہی انقلاب اسلام نے کیا تھا۔ چنانچہ قرآن اسی انقلاب کی تعلیم کا علمبردار ہے میری خوش قسمتی تھی کہ شاہ ولی اللہؒ جن سے مجھے پہلے سے دلچسپی اور عقیدت تھی میں نے ان کو قرآن کی اس طرح تفسیر کرنے والا پایا۔ روشنی کی اس کرن نے میرے دماغ میں ایک انقلاب پیدا کر دیا اور میری مایوسیاں آس اور امید میں بدل گئیں۔ یہاں سے میری زندگی کا نیا دور شروع ہوتا ہے۔ مجھے قرآن میں ایک نئی دنیا نظر آئی اور مجھے اس عقیدہ پر یقین حاصل ہو گیا کہ جو روس کے انقلابی کر سکتے ہیں۔ قرآن پر عمل کر کے مسلمان اس سے بڑھ کر انقلاب کر سکتے ہیں۔ یہ فکر یا خیال محض میرے اپنے دماغ کی ایک پرواز نہ تھا کہ کوئی اسے ایجاد بندہ کہہ کر ٹال سکے۔ میں نے شاہ ولی اللہؒ کو اس خیال کا ترجمان اور مفسر پایا اور شاہ ولی اللہؒ کے بعد میں آنے والوں اور ان سے پہلے بزرگوں اور استادوں کا سلسلہ ایسا ہے کہ کوئی معقول مسلمان اس سے انکار کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔

یہی حکمت ہے کہ میں فلسفہ ولی اللہی پر اصرار کرتا ہوں اگر یہ فکر میں اپنا کہہ کر پیش کروں تو ہر شخص اسے میری اپج کہہ کر ماننے سے انکار کر دے گا۔ میں اس فکر کا اساس اور اس کی تشریحات شاہ صاحب کی کتابوں سے بتاتا ہوں۔ اب اگر کوئی مسلمان انکار کرتا ہے تو یہ اس کی ہٹ دھرمی ہے۔

ہاں! مجھے یہ امر تسلیم ہے کہ شاہ صاحب کی کتابوں میں یہ فکر بالکل مرتب اور مدون نہیں۔ اس زمانہ میں اور ان حالات میں اس قسم کی ترتیب اور تدوین کا کوئی امکان نہ تھا۔ مجھے اس کے ماننے میں بھی تامل نہیں کہ شاہ صاحب کی کتابوں میں بہت کچھ بھرتی

ہے۔ مثلاً یہ ہو سکتا ہے کہ دو تین سو صفحے کی ایک کتاب ہو اور اس میں چار پانچ صفحے میرے کام کے ہوں۔ شاہ صاحب کے ہاں اکثر ایسی باتیں بھی پائی جاتی ہیں، جو ٹھیک نہیں۔ میرا کام یہ ہے کہ میں آپ اس فکر کو شاہ صاحب کی کتابوں میں سے طلبہ کو بتا دوں گا میری صرف یہی آرزو ہے اور اس کے لئے میں وطن آنے پر آمادہ ہؤا۔ میری زندگی کے معلوم نہیں کے دن اور ہیں چاہتا ہوں، ان میں اپنے اس فکر کے لوگوں کو متعارف کرا دوں۔

میں مانتا ہوں کہ آج کل ذہین طبع نوجوانوں میں جو شکوک پیدا ہوتے ہیں میں سب کے سب کا جواب نہیں دے سکتا لیکن میرا خیال ہے کہ جب کوئی نوجوان شک سے بیزار ہونے لگے۔ اور وہ زندگی میں کوئی مثبت چیز چاہے تو اس وقت میں اسے مطمئن کر سکتا ہوں۔ اس سلسلہ میں میں ایک بات اور عرض کرتا ہوں۔ میں نے روس میں انقلاب کو برسرپیکار دیکھا اور انقلابیوں نے مذہب کے انکار میں جو زور باندھ رکھا تھا اس کا بھی مشاہدہ کیا۔ میرا یقین ہے کہ یہ روسی انقلاب کی آخری منزل نہیں ہے روسی میرے نزدیک اس منزل سے آگے بڑھ کر رہیں گے اور اس منزل میں خدا کے انکار کی جو صورت ہے وہ اگلی منزل میں نہیں رہے گی۔ یہی حالت ہندوستان کے انقلابی نوجوانوں کی آگے چل کر ہو گی۔ ممکن نہیں بلکہ اغلب ہے کہ وہ انقلاب کے ابتدائی دور میں اسلام کا کلی طور پر انکار کر دیں۔ منزل سے گذر کر اپنے لئے کوئی یقین ڈھونڈیں گے۔ تو میرے خیال میں شاہ صاحب نے جو اسلام کی تفسیر کی ہے وہ ان کے لئے اطمینان اور تسلی کا باعث ہو سکے گی۔

شاہ ولی اللہؒ کے فکر میں ایک آفاقی وسعت ہے، عالمگیر انسانیت ہے۔ ازل سے لے کر ابد تک کے تمام فکری، دینی اور فلسفیانہ نظاموں کو ایک رشتہ میں ہم آہنگ کر دیا گیا ہے۔ اور پھر اس وسعت اور بے کنار ہونے کے باوجود ولی اللّٰہی فکر میں ترتیب ہے اور نظم ہے۔ گویا کہ یہ ریاضی یا حساب کا کوئی مسئلہ ہے۔

(میں نے مولانا سے شاہ صاحب کے اس حیرت انگیز عقلی کمال کے اسباب دریافت کئے)

فرمانے لگے کہ افلاطون کا اشراقی فکر مسلمان ارباب تصوف کی بدولت ارتقاء کی بہت سی منزلیں طے کر کے شاہ صاحب تک پہنچا تھا۔ اور سب سے بڑی چیز جس نے شاہ صاحب کے فکر کو سنوارا ہے وہ اکبری عہد ہے۔ اکبری عہد میں سلطنت کے مختلف مذاہب کو ایک اصول کے ماتحت لانے کی کوشش کی گئی تھی۔ بے شک اکبر کے زمانہ میں بے دینی اور الحاد کی باتیں بھی کی جانے لگیں۔ لیکن یہ حرکات چند افراد تک محدود تھیں۔ سوال اصل میں ایک اصول کا تھا اور وہ یہ تھا کہ ہندو، مسلمان، شیعہ، سنی سب مل جل کر ایک نظام میں رہیں۔ اس ضرورت نے اہل فکر کو مجبور کیا ہو گا کہ کوئی ایسا اساس ڈھونڈیں جس سے اسلام کی صداقت پر زد نہ پڑے اور مختلف مذاہب کی آپس میں کھینچا تانی بھی ختم ہو جاتے۔ اس رجحان نے کہیں کہیں زندقہ کی شکل بھی اختیار کی لیکن جہاں تک فکر کا تعلق ہے وہ تو فی نفسہٖ بلیات سے منزہ رہا ہو گا۔

مولانا نے اس کی مثال میں روس کا موجودہ نظام پیش کیا اور فرمایا کہ اشتراکیت نے معاشی زندگی کو ایک خاص اصول پر منظم کیا ہے۔ اب روس میں لادینیت بھی ہے۔ لیکن یہ لادینیت چند اسباب کا نتیجہ ہے اور ایک خاص طبقہ تک محدود ہے معاشی زندگی کی تنظیم اشتراکیت کا اساسی قاعدہ ہے اور لادینیت یا انکار مذہب اس کے چند مظاہر ہیں۔ ان مظاہر کی وجہ سے معاشی زندگی کی اشتراکی تنظیم کو بُرا کہنا کہاں تک درست ہے۔ اسی طرح اکبری عہد کا حال ہے۔ اکبری عہد نے ملتوں اور قوموں میں ایک وفاق پیدا کرنے کی کوشش کی یہ کوشش نہایت مفید اور صالح تھی۔ اس سلسلہ میں جو بے اعتدالیاں ہوئیں وہ زیادہ قابل توجہ نہ تھیں۔ ان کی حیثیت آنی جانی تھی۔

عید قربان کی تاریخی حیثیت

مقصد ——— اور فضائل ومسائل

قربانی کا آغاز کب ہؤا ——— اور انبیاء سابقین میں اس کا رواج ——— ایک تاریخی تجزیہ

حافظ قاری فیوض الرحمٰن ایم اے۔ صدر شعبۂ اسلامیات گورنمنٹ کالج، ایبٹ آباد

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم:۔

ہر قوم کے اپنے مخصوص تہوار ہوتے ہوتے ہیں اور یہ تہوار معاشرہ کی جان ہوتے ہیں۔ ان سے سوسائٹی میں اتفاق، اتحاد اور ربط پیدا ہوتا ہے۔ تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر تہوار کسی اہم واقعہ کی یاد میں منایا جاتا ہے۔ پس اگر کوئی دن کسی عظیم تاریخی واقعہ کی حیثیت سے تہوار قرار دیا جا سکتا ہے تو اس "امتِ مسلمہ" کے لئے جو ملتِ ابراہیمی کے وارث اور اسوۂ خلیلی کی نمائندہ ہے۔ دس ذی الحجہ کا دن بہت بڑا تہوار ہے۔ یہ وہ مبارک دن ہے جس میں امتِ مسلمہ کے مؤسس اور مورثِ اعلیٰ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ تعالٰے کا اشارہ پا کر اپنے

کعبہ شریف میں
مقام ابراہیم

لخت جگر حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو قربانی کے لئے بارگاہِ الٰہی میں پیش کیا ان کے گلے پر چھری رکھی اور کامل انقیاد و رضا اور تسلیم کا ثبوت دیا۔ اللہ تعالےٰ نے عشق و محبت اور قربانی کے اس امتحان میں انہیں کامیاب قرار دیا۔ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو سلامت رکھا اور ان کی جگہ ایک جانور کی قربانی قبول فرما لی۔ امامت کا تاج آپ کے سر پر رکھا اور ان کی اس ادا کی نقل کو قیامت تک کے لئے "رسم عاشقی" قرار دیا گیا۔ اور جس بنجر وادی میں اس قربانی کا واقعہ پیش آیا تھا اس میں پورے عالم اسلام کا سالانہ اجتماع رکھا اور ہر اسلامی شہر اور بستی میں تقریبات نماز و قربانی وغیرہ کی یادگار کو باقی رکھا۔ ہم یہ "عید قربان" کا تہوار ہر سال اسی خوشی میں مناتے ہیں۔

عید قربان کا معنیٰ

قربان — اللہ کے حضور کسی چیز کا پیش کرنا۔ اَلْقُرْبَانُ مَا تُتَقَرَّبُ بِہٖ اِلَی اللّٰہِ تَعَالٰی — یعنی قربانی وہ شے ہے جس سے خدا تعالےٰ کا قرب حاصل ہو (مختار الصحاح)

امام راغب نے بھی اسی طرح لکھا ہے۔ اَلْقُرْبَانُ مَا یَتَقَرَّبُ بِہٖ اِلَی اللّٰہِ تَعَالٰی۔

امام ابوبکر جصاصؒ کہتے ہیں کہ "قربانی ہر وہ نیک عمل ہے جس کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ کی رحمت سے قرب کا ارادہ کیا جائے" "اَلْقُرْبَانُ مَا یُقْصَدُ بِہِ الْقُرْبُ مِنْ رَّحْمَتِ اللّٰہِ تَعَالٰی مِنْ اَعْمَالِ الْبِرِّ" مگر عام بول چال میں یہ لفظ اکثر ذبیحہ کے لئے بولا جاتا ہے اور قرآن مجید میں بھی اس معنیٰ میں استعمال ہوا ہے "بِقُرْبَانٍ تَاْکُلُہُ النَّارُ" (آل عمران)

اس مبارک موقع پر چونکہ جانوروں کی قربانی اللہ تعالےٰ کی بارگاہ میں پیش کی جاتی ہے اس لئے اسے عید قربان کہا جاتا ہے۔

قربانی کا آغاز

اور انبیائے سابقین میں اس کا رواج

کسی حلال جانور کو اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے ذبح کرنا آدم علیہ السلام کے زمانہ ہی سے شروع ہو گیا تھا۔ سب سے پہلی قربانی حضرت آدم علیہ السلام کے دو بیٹوں (ہابیل اور قابیل) نے دی تھی۔ یہ قربانی گویا ان کا امتحان تھا۔ قرآن حکیم میں اس کا ذکر موجود ہے (وَاتْلُ عَلَیْھِمْ نَبَاَ ابْنَیْ اٰدَمَ بِالْحَقِّ اِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا۔ فَتُقُبِّلَ مِنْ اَحَدِھِمَا وَلَمْ یُتَقَبَّلْ مِنَ الْاٰخَرِ قَالَ لَاَقْتُلَنَّکَ ط قَالَ اِنَّمَا یَتَقَبَّلُ اللّٰہُ مِنَ الْمُتَّقِیْنَ ہ (المائدہ ۲۷) "اور سنا ان کو حال واقعی آدم کے دو بیٹوں کا۔ جب کہ دونوں نے کچھ قربانی اور مقبول ہوئی ایک کی اور نہ مقبول ہوئی دوسرے کی، کہا، میں تجھ کو مار ڈالوں گا۔ وہ بولا۔ اللہ تو قبول کرتا ہے پرہیزگاروں سے۔"

یہ آدمؑ کے دو صلبی بیٹوں قابیل و ہابیل کا قصہ ان کو سناؤ کیونکہ اس قصہ میں ایک بھائی کے دوسرے بھائی کی مقبولیت اور تقوے پر حسد کرنے اور اسی غیظ میں اس کو ناحق قتل کر ڈالنے کا ذکر ہے۔

پھر انبیائے سابقین میں بھی اس کا رواج رہا۔ قربانی کے قبول ہونے کی پہچان اس وقت یہ تھی کہ ایک آگ آسمان سے اتر کر اس قربانی کو کھا جاتی تھی۔ قربانی عرصۂ دراز تک انبیائے کرامؑ کی صداقت کی دلیل رہی اہلِ کتاب کی تقریر کا حوالہ قرآن کریم نے دیا ہے۔ اَلَّذِیْنَ قَالُوْآ اِنَّ اللّٰہَ عَھِدَ اِلَیْنَآ اَلَّا نُؤْمِنَ لِرَسُوْلٍ حَتّٰی یَاْتِیَنَا بِقُرْبَانٍ تَاْکُلُہُ النَّارُ ط قُلْ قَدْ جَآءَکُمْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِیْ بِالْبَیِّنٰتِ وَ بِالَّذِیْ قُلْتُمْ فَلِمَ قَتَلْتُمُوْھُمْ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ہ (آل عمران ۱۸۳)

ترجمہ: وہ ایسے لوگ ہیں کہ کہتے ہیں کہ اللہ نے ہمیں حکم فرمایا تھا کہ ہم کسی پیغمبر پر اعتقاد نہ لائیں جب تک کہ ہمارے سامنے معجزہ نذر و نیاز خداوندی کا ظاہر نہ کرے کہ اس کو آگ کھا جائے۔ آپؐ فرما دیجئے کہ بالیقین بہت سے پیغمبر مجھ سے پہلے بہت سے دلائل لے کر آئے اور خود یہ معجزہ بھی جس کو تم کہہ رہے ہو۔ سو تم نے ان کو کیوں قتل کیا تھا، اگر تم سچے ہو۔

آیت کے آخری حصے میں تسلیم کیا گیا ہے کہ قربانی واقعی انبیائے کرام کی صداقت کی دلیل ٹھہرائی گئی تھی۔

تورات میں ہے کہ ابراہیم علیہ السلام اپنی زندگی میں بار بار قربانی کرتے تھے۔

"تب خدا نے ابراہیمؑ کو دکھلائی دے کر کہا کہ یہی ملک میں تیری نسل کو دوں گا۔ اور اس نے وہاں خداوند کے لئے جو اس پر ظاہر ہوا ایک مذبح بنایا۔" (پیدائش ۱۲-۷)

یہود میں بھی قربانی کا وجود تھا۔ چنانچہ یہودی اپنے اہل و عیال اور مال مویشی کی سلامتی کے لئے قربانی دیا کرتے تھے۔ (خروج ۲۰-۲۳)

اور تورات میں ہے کہ "ایلیا نبی نزدیک آیا۔ بولا کہ اے خداوند! ابراہیمؑ اسحٰقؑ اور اسرائیل کے خدا! آج کے دن معلوم ہو جائے گا کہ تو اسرائیل کا خدا ہے اور میں تیرا بندہ ہوں۔ اور

میں نے یہ سب کچھ تیرے کہنے سے کیا ہے۔ تب خداوند کریم کی طرف سے آگ نازل ہوئی اور اس نے اس سوختنی قربانی اور لکڑیوں پتھروں اور پانی کو جلایا۔ (سلاطین ۱۸-۳۷-۳۸)

اسی طرح تواریخ ۷-۱ میں ہے:۔

"اور جب سلیمان دعا مانگ چکا تو آسمان سے آگ اُتری اور سوختنی قربانی اور ذبیحوں کو کھا گئی اور وہ گھر خداوند کے جلال سے بھر گیا"۔

دیکھئے کس طرح "بِقُرْبَانٍ تَأْكُلُهُ النَّارُ" کی تصدیق ہو رہی ہے اور قرآن مجید کا ارشاد بھی یہی ہے:۔

"وَلِكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا" اور لِكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا هُمْ نَاسِكُوهُ" (الحج ۳۴-۶۷)

ترجمہ: اور جتنے اہلِ شرائع گذرے ہیں۔ ان میں سے ہم نے ہر اُمت کے لئے قربانی کرنا مقرر کیا تھا"۔

اور تفسیر "المراغی" میں ہے وَجَعَلْنَا لِأَهْلِ كُلِّ دِينٍ مِّنَ الْأَدْيَانِ الَّتِي سَلَفَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ ذَبَائِحَ يَذْبَحُونَهُ وَدَمًا يُرِيقُونَهُ عَلَى وَجْهِ التَّقَرُّبِ لِلّٰهِ وَلَيْسَ ذٰلِكَ خَاصًّا بِقَوْمٍ دُونَ آخَرِينَ ٥ یعنی ہم نے تمام سابقہ ادیان میں بھی قربانی مقرر کی تھی، وہ قومیں بھی اللہ کا قرب حاصل کرنے کے لئے جانور ذبح کرتی رہی ہیں۔ چنانچہ برطانوی قاموس العلم میں مندرجہ ذیل عبارت مرقوم ہے:۔

ترجمہ: قربانی کا طریق مختلف اقوام میں خواہ کتنا ہی غلط ہو اس کا رواج تقریباً عام ہو رہا ہے۔ قربانی کا تصور یہودی اور غیر یہودی مذاہب میں بنیادی رہا ہے۔ عیسائیت نے بھی اسے ختم نہ کیا بلکہ تھوڑے سے تغیر اور تبدل کے بعد اختیار کئے رکھا۔ (انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا)

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قربانی کا ایک عظیم الشان واقعہ

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تقریباً ساری زندگی ابتلاء و آزمائش ہی میں گذری ہے، کبھی تو مشرک قوم کو دعوتِ حق دے رہے ہیں اور قوم کی طرف سے جو مصیبتیں آتی ہیں، برداشت کر رہے ہیں، کبھی والدہ کی دھمکیاں سن رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی توحید کے "جرم" میں آگ میں ڈالے جا رہے ہیں، خدا کی رضا کے لئے ہجرت فرما رہے ہیں۔ اہلیہ محترمہ اور بیٹے کو بے آب و گیاہ لق و دق اور گرم ریگستان میں خدا کی رضا کی خاطر چھوڑ رہے ہیں۔ آزمائشوں پر آزمائشیں آ رہی ہیں مگر پائے ثبات میں کہیں بھی لغزش آنے نہیں پاتی۔ آخر بیٹے کی قربانی کا مرحلہ آتا ہے۔ بیٹا بھی وہ جو بڑھاپے کی حالت میں دعائیں مانگ کر ملا ہے۔ اب خوب چلنے پھرنے کے لائق ہوا ہے اور باپ کا ہاتھ بٹانے کی عمر تک پہنچ چکا ہے۔ عین اس وقت خواب میں اشارہ پا کر اسے قربان کرنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ ایمان، اطاعت اور تسلیم کا اندازہ لگائیے کہ باپ، بیٹے کو ذبح کرنے کے لئے تیار ہے۔ یہ تیاری جزع و فزع، خلجان اور پریشانی کے عالم میں نہیں ہے بلکہ قبول، رضا اور سکونِ قلب سے ہے، بیٹے سے فرماتے ہیں:۔

يَا بُنَيَّ إِنِّي أَرَىٰ فِي الْمَنَامِ أَنِّي أَذْبَحُكَ فَانظُرْ مَاذَا تَرَىٰ ؟ بیٹا! میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ تجھے ذبح کر رہا ہوں، اچھا بتاؤ تمہارا کیا خیال ہے؟ بیٹا بھی اخلاص، انقیاد، اطاعت، رضا اور یقین کا پیکر ہے محبت بھرے انداز میں کہتا ہے "يَا أَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِي إِن شَاءَ اللَّهُ مِنَ الصَّابِرِينَ ٥" ابا جان! تعمیلِ حکم میں دیر نہ کریں آپ مجھے صبر کرنے والوں میں سے پائیں گے"۔

بیٹا یہ جانتا ہے کہ یہ خواب کا معاملہ ہے اور خواب خدا کے پیغمبر کا ہے (تفسیر روح المعانی میں ہے — وَرُؤْيَا الْأَنْبِيَاءِ وَحْيٌ كَالْوَحْيِ فِي الْيَقْظَةِ، انبیائے کرام کا خواب بیداری کی طرح وحی ہے) اس لئے اپنی رائے کا اظہار "افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ" سے کر رہا ہے ؎

یہ فیضانِ نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی
سکھائے کس نے اسمٰعیل کو آدابِ فرزندی

آخر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بیٹے ہیں۔ باپ بیٹا دونوں ہی اللہ کے انتہائی فرمانبردار ہیں ؎

شاباش آں صدف کہ چناں پروردگہر
آباء ازو مکرم اَبناء عزیز تر!

(باقی آئندہ)

(گذشتہ سے پیوستہ)

تصوّف کی انقلابی حیثیّت!

شاہ ولی اللہ محدّث دہلوی رح کے طریق کار کی روشنی میں!

از:- محمّد مقبول عالم بی، اے - لاہور

امام ولی اللہ دہلویؒ کے انقلابی تصوف کا کمال یہ ہے کہ اس کا فائدہ دنیا میں بھی ملتا ہے اور آخرت میں بھی۔ قرآنی تعلیم و تربیت سے دنیا میں جنتی معاشرہ پیدا ہوتا ہے اور آخرت میں جنت الفردوس حاصل ہوتی ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم کی دعا ہے کہ رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً ط

دینی اور سیاسی جماعتوں کا فرض ہے کہ وہ معاشرے کی اسی طریق پر تشکیل کریں۔ علمائے کرام کا فرض ہے کہ وہ عوام کے لیے قرآن کے درس جاری کریں، خواص کے لیے قرآنی درس گاہیں اور کالج قائم کریں اور باقاعدہ قرآن حکیم کی تعلیم دیں اور اس کے مطالب سمجھائیں مسلمان بچوں کے لیے یہ ضروری ہے کہ سب سے پہلے انہیں قرآن ناظرہ پڑھا دیا جائے پھر اس کا ترجمہ سکھایا جائے اور عربی زبان پڑھائی جائے اس کے ساتھ دوسرے علوم کی تعلیم بھی درجہ بدرجہ شروع

کی جا سکتی ہے۔ اس طرح مسلمان بچوں کے سینوں میں "بقول امام ولی اللہ دہلوی" بچپن ہی سے قرآن کے معانی و مطالب بھر دیئے جائیں۔

مساجد کے خطبا کا فرض ہے کہ وہ اِدھر اُدھر کی باتیں سنانے کے بجائے اپنے خطباتِ جمعہ میں لوگوں کو قرآن کا پیغام سنائیں اور اس کے مضامین کو اپنے حالات پر منطبق کر کے دکھائیں کہ آج ہمارے لیے قرآن حکیم سے کیا سبق حاصل ہوتا ہے۔ ہمارے خطبا کے اکثر خطبے بے جان ہوتے ہیں کیونکہ ان میں کوئی پیغام نہیں ہوتا۔

صوفیائے کرام کا فرض ہے کہ وہ لوگوں سے کتاب و سنت پر عمل کرنے کے لیے بیعت لیں اور ان سے حق کے لیے اطاعت کا وعدہ لیں۔ معاشرے کے افراد کی تربیت اور تزکیہ کی ذمہ داری ان حضرات پر بہت زیادہ ہے۔ ذکر اعمال و اشغال تو اس لیے ہیں کہ طبیعت کی سرکشی کو دور کیا جائے، نفس کو رام کیا جائے اور اسے اطاعت الٰہی کے لیے تیار کیا جائے، محض تسبیحیں پھیرنا مقصود نہیں ہے۔ ہم ذیل میں بیعت کنندگان کے لیے امام ولی اللہ دہلویؒ کے طریقِ تصوف کی روشنی میں ایک پروگرام کا خاکہ پیش کرتے ہیں۔ کہ انہیں کس طرح ایک مثالی معاشرے کی صورت میں ڈھالا جا سکتا ہے۔

۱۔ سب سے پہلے بیعت کنندہ کو قرآن حکیم کی تعلیم کی طرف متوجہ کیا جائے اور اسے نماز کا پابند بنایا جائے۔ بیعت کنندہ کے اہل خانہ بھی اس کے ساتھ شریک ہوں۔ تاکہ وہ بھی بے خبر نہ رہیں اور تعلیم و تربیت پائیں۔ (قُوا اَنْفُسَکُمْ وَاَھْلِیکُمْ نَارًا)

۲۔ اس کے بعد انہیں ذکر کے اعمال و اشغال سکھائے جائیں اور ان کے لیے مجالسِ ذکر کا اہتمام کیا۔

۳۔ بیعت کنندگان کے معاشی و معاشرتی حالات کی اصلاح بھی ضروری ہے۔ امام ولی اللہ دہلویؒ کی حکمت کے مطابق اصلاحِ اخلاق کے لیے معاشی و معاشرتی ماحول کی اصلاح شرطِ اول کا حکم رکھتی ہے۔ اُن کے نزدیک اخلاق ماحول کی پیداوار ہیں علوم کی نہیں۔ انسان کا معاشی و معاشرتی ماحول انسان کے اندر افکار پیدا کرنے کا ایک بڑا سبب ہے اور افکار اعمال کی بنیاد بنتے ہیں۔ گویا جیسے ماحول ہوگا ویسے ہی افکار پیدا ہوں گے اور ایسے ہی اُن سے اعمال سرزد ہوں گے۔

ہمارے پرانے صوفیائے کرامؒ کا دستور تھا کہ وہ اپنے مریدوں کے معاشی و معاشرتی حالات کی اصلاح کا بھی خیال رکھتے تھے اور ان کے لیے رزقِ حلال پیدا کرنے کا انتظام کرتے تھے۔ وہ غریبوں اور محتاجوں کے لیے لنگر جاری کرتے تھے۔ ایسے ہی وہ ان کی معاشرتی مشکلات حل کرنے میں بھی ان کی مدد کرتے تھے۔ لیکن اب ان باتوں کو نظرانداز کر دیا گیا ہے اور محض چند اوراد و اشغال سکھا کر سمجھ لیا جاتا ہے کہ سلوک و تصوف کا حق ادا کر دیا۔

۴۔ صوفیائے کرامؒ کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنے مریدوں کو منظم کریں اور انہیں ایک پاکیزہ معاشرے کی صورت میں ڈھالیں اور انہیں دوسروں کے لیے نمونہ بنائیں تاکہ اور لوگ اس حلقہ میں داخل ہوں۔ جماعت کے اندر الفت و محبت، اخوت و ہمدردی اور شفقت کے جذبات پیدا کریں۔ جماعت کے بے کار افراد کو اپنے مریدوں کے ذریعے کام پر لگانے کی کوشش کریں اور جب تک کام نہ ملے بیت المال سے وظائف دیں۔ ایسے بیوگان، یتامیٰ مساکین، اپاہج، بیمار اور بوڑھے افراد کے لیے وظائف مقرر کریں۔ یہ اس صورت میں ہو سکتا ہے کہ جماعت کے امیر لوگوں کی دولت غریبوں کے کام آئے اور امیر لوگوں کو سادہ زندگی بسر کرنے پر راضی کیا جائے تاکہ وہ ضرورت سے زیادہ دولت خوشدلی سے بیت المال میں دے دیں۔ جماعت میں سب کے لیے متوسط معیار زندگی قائم کیا جائے۔ بیاہ شادی وغیرہ کی تقریبات پر فضول رسم و رواج اور اسراف و تبذیر کو روک دیا جائے اور فیشن پرستی کے رجحان کو بھی ختم کیا جائے۔ بُری عادتوں سے پرہیز کرنے کی تلقین کی جائے۔ خصوصاً جماعت کے افراد کو تمباکو نوشی، سینما بینی، تاش وغیرہ کھیلوں سے منع کیا جائے۔ انہیں ریڈیو اور ٹیلیویژن کے بے فائدہ پروگراموں میں وقت ضائع کرنے سے بچایا جائے۔ مکانوں کی آرائش و زیبائش، لباس، زیورات وغیرہ میں اسراف سے بچنے کی تلقین کی جائے۔

شیخ الحدیث مولانا عبد الحق اکوڑہ خٹک

کی کامیابی پر

حافظ عبد الحلیم کلاچوی

عبدِ حق تجھ کو مبارک ہو کہ چمکا حق ترا
ہے دعا میری کہ چمکے عمر بھر تک حق ترا
شیخ مدنیؒ کے فیوض و علم کا تو ہے امیں
تو حدیثِ یارؐ کا اس ملک میں کامل مبیں
عبدِ حق تو اب تلک تھا منبر و محراب میں
اب گرج ہوگی تری آئین کے ابواب میں
چاہتا ہے رب کہ اب تو اس حدیثِ یار کو
جا کے بتلا دے حکومت کے در و دیوار کو
ہے دعا میری یہ ہر منظوم میں منثور میں
ہو اُجالا حق ترے کا مجلسِ دستور میں

●

۵۔ اس کے علاوہ مریدوں کی معاشرتی مشکلات بھی حل کی جائیں۔ اس سے محبت و الفت کے رشتے مضبوط ہوں گے اور فضول رسم و رواج کے لیے بھی مجبور ہونا نہیں پڑے گا۔ لڑکی والوں کو جہیز اور دعوت وغیرہ کے لیے مجبور نہ کیا جائے۔ لڑکے والے دعوت ولیمہ کریں لیکن کسی لمبی چوڑی دعوت کا اہتمام نہ کریں۔ جماعت کے جھگڑوں کو نمٹانے کے لیے پنچایت قائم کی جائے اور سب پنچایت کے فیصلے قبول کریں۔

۶۔ مریدوں کے اخلاق کی اصلاح پر بہت زور دیا جائے۔ اخلاق کا تعلق معاشرے سے ہے۔ اکیلا شخص جو کسی جنگل میں رہتا ہے اسے بااخلاق نہیں کہا جا سکتا۔ اچھا شہری وہ ہے جو اپنے بیوی بچوں، اپنے محلے والوں، شہر والوں، ملک والوں اور دنیا والوں کے ساتھ اچھا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔ خیرکم خیرکم لاھلہ۔ (تم میں سے اچھا شخص وہ ہے جو اپنے گھر والوں کے ساتھ اچھا ہے۔) اس لیے اچھائی کا معیار عبادات کے بعد مخلوقِ خدا کے ساتھ حسنِ سلوک بھی ہے۔ اخلاق کی تربیت اس نقطۂ نگاہ سے کی جاتی ہے کہ وہ خدامِ خلق بنیں۔ ورنہ ان کا سلوک و تصوف بے حقیقت شے ہوگی۔ اس سلسلے میں امام ولی اللہ دہلویؒ نے مندرجہ ذیل چار

اخلاق کی تربیت کا حکم دیا ہے۔

(ا) طہارت یعنی پاکیزگی اور صفائی۔ اس میں بدن، لباس، ماحول اور افکار کی پاکیزگی سب شامل ہیں۔ اس لیے مریدین اپنے گھروں، محلوں، اور بستیوں کو بھی پاک و صاف رکھیں۔

(ب) اخبات یعنی عجز و نیاز۔ مرید جہاں اللہ کے حضور عجز و نیاز کریں وہاں خلقِ خدا کے لیے بھی شفیق بنیں۔

(ج) سماحت یعنی سیر چشمی و فیاضی۔ مریدوں کے لیے ضروری قرار دیا جائے کہ وہ ایثار و قربانی کرنے والے بنیں، نہ کہ لوٹ کھسوٹ کرنے والے۔ ان کے اندر سے دنیا کی محبت نکال دی جائے اور خدا اور خلق خدا کی محبت بھر دی جائے۔ وہ دوسروں کو اپنے اوپر ترجیح دیں اور دین کو دنیا پر مقدم کریں، اکتناز، احتکار، بخل وغیرہ امراض سے بچیں اور انفاق فی سبیل اللہ کرتے رہیں۔

(د) عدالت: یعنی عدل اور اعتدال مرید ہر معاملے میں عدل و انصاف سے کام لیں اور اعتدال پر قائم رہیں۔ زندگی درمیانہ درجے کے معیار کے مطابق بسر کریں، عیاشی اور اسراف و تبذیر سے بچیں۔

اگر افراد جماعت کی ان اخلاق کے مطابق تربیت کی جائے گی تو وہ ایک مثالی معاشرہ قائم کرنے والے ثابت ہوں گے۔ امام صاحب کے نزدیک یہ چاروں اخلاق ساری شریعت اسلامیہ کا نچوڑ ہیں اور تصوف و سلوک کی غرض و غایت بھی یہی ہے۔ ان میں عدالت قرآنی انقلاب کا محور ہے۔

۷۔ اس کے بعد مریدوں کی روحانی تربیت آتی ہے۔ امام ولی اللہ دہلویؒ فرماتے ہیں کہ ہر انسان کے اندر اللہ تعالیٰ نے ایک نقطہ نورانیہ رکھا ہے، جسے وہ حجرِ بحت کہتے ہیں۔ یہ وہی چیز ہے جس کا ذکر قرآن حکیم نے اس آیت میں کیا ہے۔ فَاذا نفختُ فیہ من رُوحی فقعولہٗ ساجدین۔ (جب میں آدم کے پتلے میں اپنی روح میں سے پھونک دوں تو اس کے آگے سجدے میں گر کر جھک جاؤ) حجرِ بحت اللہ تعالیٰ کی تجلی کو قبول کرتا ہے۔ اسی لیے خدا کی ہستی کا اقرار

اور اس کے آگے جھکنے کا جذبہ انسانیت کا ایک لازم جزء ہے۔ انسان کے حجرِ بحت کو بیدار کرنے اور اس کا اتصال ذاتِ خداوندی کے ساتھ قائم کرنے کا نام امام صاحب کی زبان میں اقتراب ہے۔ اور جن طریقوں سے یہ کیفیت حاصل ہوتی ہے انہیں ارتفاقات الٰہیہ کہتے ہیں۔ یہی اُن کا مقامِ احسان ہے اور اسی کو عام اصطلاح میں تصوّف و سلوک کہا جاتا ہے۔

جب تصوف کے اعمال و اشغال سے انسان کے حجرِ بحت کا تعلق ذاتِ خداوندی سے قائم ہو جاتا ہے، تو پھر علوم روحانیہ کا دروازہ کھل جاتا ہے اور اسے نورِ بصیرت حاصل ہو جاتا ہے۔

امام صاحب نے لطائف کی تکمیل کا کورس بھی مقرر فرمایا ہے اور عام اہل تصوف کے لطائف کے علاوہ لطیفۂ جوارح کی تکمیل کا سبق بھی دیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنے ہاتھ پاؤں کے اعمال و افعال پر بھی نگاہ رکھے۔ ان لطائف کی تفصیلات ان کی تصنیفات مثلاً القول الجمیل، ہمعات، الطاف القدس وغیرہ میں مل سکتی ہیں۔ ان کے پسندیدہ اوراد و اشغال بھی ان کتابوں میں موجود ہیں۔

شارح حکمت ولی اللّٰہی حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ تصوّف کے بارے میں فرماتے ہیں۔

"عام طور پر تصوّف کو اخلاق سے شروع کیا جاتا ہے۔ معاشی ضروریات حیوانی زندگی کے لیے تسلیم تو کی جاتی ہیں لیکن ان کا انسانیت سے تعلق تسلیم نہیں کیا جاتا۔ جس کی وجہ سے ہماری سیاست کھوکھلی ہو گئی ہے اور ہمارے عقلمند اور بااخلاق لوگ سیاست سے الگ رہنا ہی اپنا کمال سمجھنے لگ گئے ہیں۔"

لیکن حضرت امام ولی اللہ دہلوی نے انسانی معاشی ضروریات کو انسانیت کا براہِ راست جزء قرار دے کر سمجھا دیا ہے، کہ ان ضروریات کا پورا کرنا بھی اسلامی انقلاب کے لیے ضروری ہے۔ چنانچہ مولانا عبید اللہ سندھیؒ آگے فرماتے ہیں۔

"انسانی اجتماعی زندگی کے لیے اقتصادی نظام ایسا ہونا ضروری ہے جو اُن کی ضروریات کو پورا کر دے اور اس کے بعد ان کے پاس کچھ وقت بچ جائے تاکہ وہ اپنے لطائف کی تکمیل پر غور کر سکیں۔"

(الفرقان ولی اللہ نمبر صفحہ ۳۳۲)

غرض امام ولی اللہ دہلویؒ جذبہ احسان (تصوّف) کو قرآنی انقلاب قائم کرنے کے لئے کارکنوں کی تیاری کے واسطے استعمال کرتے ہیں۔

امید ہے کہ اگر ہمارے صوفیائے کرام جو لوگوں سے بیعت لیتے ہیں۔ ان اصولوں پر اپنے مریدوں کی تربیت کریں گے اور اس پروگرام کے مطابق اُن کی تنظیم کریں گے، تو وہ قرآنی انقلاب کے لیے اچھے افراد تیار کر سکیں گے ایسے افراد ہی اس قابل ہوں گے کہ وہ معاشرے اور مملکت کا نظام خدا ترسی اور انصاف کے تحت چلا سکیں۔ اور استحصال سے باز رہ سکیں۔

★

فلاحِ دین و دنیا اور اجتماعی زندگی کا روشن طریق کار

خلافتِ راشدہ کی برکات

مولوی عبدالرحمٰن لودھیانوی

جو زمانہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی خلافت سے شروع ہو کر حضرت علی کرم اللہ وجہ کے دَورِ حکومت تک ختم ہوتا ہے۔ اور جس کی مدت تیس سال رہی ہے۔ تاریخ میں اس کو عہد خلفائے راشدین کہتے ہیں۔ اس عہد میں اسلامی مدنیت پر ایک سرسری نظر

ڈالنا مناسب ہے۔ اسلامی مدنیت سے مراد وہ نظام ہے جس پر امت اپنے اجتماعی امور میں کاربند ہوئی۔ خواہ وہ امور اندرونی اصلاحوں سے تعلق رکھتے ہوں یا بیرونی جنگوں سے۔

خلافت

مدنیت کا سب سے پہلا مظہر خود اسلام، خلافت کا قیام تھا۔ رئیس امت کا لقب خلیفۂ رسول رکھا گیا۔ لیکن حضرت عمرؓ نے اپنے لئے بجائے خلیفہ کے امیرالمومنین کا لفظ پسند کیا۔ جس سے ان کے عہدہ کے صحیح مفہوم اور جمہوریت دونوں کا اظہار ہوتا ہے۔ ان کے بعد یہی لفظ تمام خلفاء کے لیے استعمال ہوتا گیا۔

خلافت دراصل دنیاوی ریاست ہے۔ جس کی بنیاد دین پر رکھی گئی ہے۔ اور اس کی غرض یہ ہے کہ اصول دین کے مطابق ہر قسم کی صلاح و فلاح کی طرف امت کی رہنمائی کی جائے۔ اس لیے خلیفہ جب تک نصوص شرعیہ کے خلاف کوئی حکم نہ دے۔ اس کی اطاعت واجب ہے۔

خلافت راشدہ کی بنیاد قرآن و سنت پر تھی۔ اگر کوئی ایسا واقعہ پیش آجاتا جس کے بارہ میں کوئی صریح حکم ان دونوں میں نہ ملتا تو امثال و نظائر پر قیاس کرکے اس کا حکم نکالتے تھے۔ خلیفہ اجتہاد مسائل میں دیگر علمائے مجتہدین سے کوئی خاص امتیاز نہیں رکھتا تھا۔ بلکہ اکثر خود ان سے سوال کرتا یا ان سے اجتہاد میں مدد لیتا تھا۔ اگر کسی امر میں سب لوگ متفق ہو جاتے تو اس کا اتباع لازم ہو جاتا۔ اسی کو اصطلاح میں اجماع کہتے ہیں۔ اور اگر باہم اختلاف ہو جاتا تو خلیفہ ان میں سے کسی صورت کو ترجیح دے کر اس کے مطابق حکم دیتا تھا

الغرض خلیفہ کو کوئی تشریعی اختیار یا کوئی ایسی دینی ریاست حاصل نہیں تھی کہ وہ جو چاہے حکم دے دے بلکہ وہ احکام دینی کو صرف ماخذ کرنے کا مجاز تھا۔

انتخاب خلیفہ کی بنیاد شوریٰ پر تھی۔ خلیفہ جو دوسرے کو اپنا ولیعہد بناتا تھا۔ تو وہ بھی مشورہ کرکے بناتا تھا۔

اس لحاظ سے اسلامی خلافت دراصل ایک طرح کی جمہوری ریاست ہے، خلیفہ کے ہاتھ پر بیعت کرتے وقت اس سے شرط کی جاتی تھی کہ کتاب و سنت کے مطابق عمل کرے گا۔ حضرت عثمانؓ کی بیعت نے سنت شیخین کا لفظ اور بڑھایا گیا

خلفاء اکثر امور میں اصحاب رائے سے مشورہ لیتے تھے۔ حضرت عمرؓ خصوصیت کے ساتھ اس کا زیادہ خیال رکھتے تھے۔ وہ کل کاموں میں اعیان صحابہ حضرت عثمانؓ حضرت علیؓ اور عبدالرحمان بن عوفؓ وغیرہ سے رائے لیا کرتے تھے۔ عبداللہ ابن عباس اگرچہ کمسن لیکن عقل و فہم میں ممتاز تھے۔ اس لیے ان کو بھی مشوروں میں شریک کر لیتے تھے۔

جب کوئی اہم معاملہ پیش آتا تو تمام مسلمانوں سے بھی رائے لیتے۔ ہر شخص آزادی کے ساتھ جو اس کی سمجھ میں آتا تھا کہتا تھا۔ الغرض نظام خلافت میں جمہوریت اور مساوات کی پوری روح موجود تھی۔

خلافت راشدہ میں شاہانہ تمکنت اور جاہ و جلال کی کوئی شان نہ تھی۔ عام لوگوں کی طرح خلیفہ بھی سڑکوں پر پیدل پھرتا تھا نہ اس کے ساتھ محافظ ہوتے تھے نہ نقیب سب لوگ اس سے ملتے تھے اور وہ سب سے ملتا تھا۔ دوسرے مسلمانوں میں اور اس میں سوائے عہدۂ خلافت کے کوئی امتیاز نہ تھا۔

محکمۂ قضاء

مقدمات کا فیصلہ قانون شرع کے مطابق خلیفہ کے فرائض میں سے تھا۔ اس لیے خلفاء اس کام کے واسطے خود اپنی طرف سے نائب مقرر کرتے تھے۔ خلیفۂ اول حضرت ابوبکر صدیقؓ کے عہد میں ہر شہر کا جو عامل ہوتا وہی فصل خصومات کی خدمت بھی انجام دیتا تھا۔ لیکن عہد فاروقی میں محکمہ قضاء کا ایک جداگانہ مستقل صیغہ قرار دیا گیا۔ اس کو انتظامی امور سے کوئی تعلق نہ تھا۔ قاضیوں کو بیت المال سے تنخواہ دی جاتی تھی۔ ان کو تجارت وغیرہ کرنے کی ممانعت تھی۔ ان تمام قاضیوں میں سے جو اس عہد میں مقرر ہوئے تھے۔ کسی کے بارے میں یہ نہیں سنا گیا کہ اس نے کسی مقدمے میں رو رعایت کی ہو یا انصاف کا خیال نہ رکھا ہو۔ ان کی نگاہوں میں ادنیٰ و اعلیٰ رعیت اور خلیفہ سب برابر تھے۔

یہ قضاۃ مجتہد مطلق نہیں ہوتے تھے۔ بلکہ ان کا کام یہ تھا کہ قانون شرعی کو اچھی طرح سمجھ کر جن واقعات اور حوادث میں کوئی صریح حکم نہ ملے نظائر و امثال پر قیاس کرکے فیصلہ کریں۔ یعنی قواعد کلیہ کا استنباط کرکے ان سے جزوی احکام نکالیں۔

قاضیوں کے علاوہ ہر شہر میں ایک جماعت ایسے لوگوں کی بھی پیدا ہوگئی تھی جو قوانین شرعیہ سے استنباط کرکے احکام تفقہ حاصل کرتی تھی۔ قاضی مشکل امور میں اس جماعت سے بھی مدد لیتے تھے۔

اس زمانہ تک احادیث رسول مدون نہیں ہوئی تھیں۔ صحابہ متفرق دیار و امصار میں تھے اور ایک کے پاس جو حدیثیں تھیں وہ دوسروں کے پاس نہیں تھیں۔ اس لیے قاضی کے فیصلے ایک ہی قسم کے معاملات میں باہم مختلف ہوتے تھے۔ کسی کو کوئی حدیث مل جاتی تو اس کے مطابق فیصلہ کر دیتا تھا۔ اور کسی کو اس کا علم نہیں ہوتا تھا۔ وہ استنباط اور اجتہاد سے کام لے کر دوسرے نتیجہ پر پہنچتا تھا۔

اس زمانہ میں فریقین کی حیثیت مستفسر سے زیادہ نہیں ہوتی تھی۔ جب ان کو اپنے معاملہ میں شرعی حکم قاضی کی عدالت سے معلوم ہو جاتا تھا تو وہ خود اس کے مطابق کاربند ہو جاتے تھے۔ قصاص اور حدود کا اجراء خود خلیفہ یا امراء صوبہ کے اختیار میں تھا۔ یہ قضاۃ صرف بڑے بڑے شہروں میں تھے۔ جو اس بات کی دلیل ہے کہ اس عہد میں باہمی تنازعات بہت کم ہوتے تھے۔

کوفہ میں حضرت عمرؓ نے شریح بن حارث کندی کو قاضی مقرر کیا تھا۔ جو متواتر پچھتر سال تک اپنے عہدہ پر رہے اور ابن زبیرؓ کی لڑائیوں کے دوران میں صرف تین سال معطل رہے۔ حضرت عمرؓ نے عبداللہ ابن قیس کو ایک ہدایت نامہ لکھ کر بھیجا تھا۔ جس میں عدالت کے یہ اصول درج کئے تھے۔

«عدالت کا فرض حکم اور سنت رسول ہے۔ اجلاس میں فریقین کو اپنے سامنے مساوی رکھو۔ تاکہ جو ادنیٰ ہو وہ تمہارے عدل سے ناامید اور جو اعلیٰ ہو وہ تمہاری رعایت کا امیدوار نہ ہو جائے۔ ثبوت مدعی کے ذمہ ہے۔ اور وہ ثبوت نہ لائے تو قسم مدعا علیہ پر۔ مصالحت جائز ہے۔ لیکن ایسی کہ جس سے حلال حرام اور حرام حلال نہ ہونے پائے۔ جو فیصلہ تم نے کیا ہے غور کرنے سے اگر حق کے

خلاف نظر آئے تو اس سے رجوع کرلو۔ جس معاملہ میں خلجان ہو اور وہ کتاب و سنت میں نہ ملے تو خوب غور کرو اس کے نظائر کو دیکھو اور ان پر قیاس کرو مدعی کو ثبوت کے لیے ایک مدت معینہ کی مہلت دو۔ اگر وہ ثبوت لے آئے تو اس کا حق دلا دو۔ ورنہ اس کے خلاف فیصلہ کر دو۔ تمام مسلمان ایک دوسرے پر شہادت کے لیے قابل اعتبار ہیں۔ سوائے ان لوگوں کے جنہوں نے حدود شرعی میں درے کھائے ہوں یا جھوٹی شہادت میں ان کا تجربہ ہو چکا ہو۔ ولا اور وراثت کے معاملہ میں مشتبہ ہوں۔"

ایک مکتوب کو عام طور پر اس عہد کے قاضیوں نے اپنا دستور العمل بنا رکھا تھا۔ حضرت عثمانؓ کے عہد میں مدینے کے قاضی زید بن ثابتؓ مقرر ہوئے اور وہاں دار القضاء بنایا گیا۔ اس سے پہلے بیشتر مقدمات مسجد میں فیصل کئے جاتے تھے

فوج

خلیفہ اول کے عہد میں کل فوج رضاکار تھی۔ نہ ان کے نام کسی رجسٹر میں درج تھے۔ نہ ان کو تنخواہ دی جاتی تھی۔ صرف مال غنیمت کے چار حصے ملتے تھے امراء لشکر اسی میں سے حصۂ رسدی کے مطابق ہر سپاہی کو تقسیم کرتے تھے۔ جو شخص کوئی نمایاں کام کرتا۔ اس کو خاص انعام دیا جاتا۔ علاوہ بریں جو مجاہد کسی کافر کو مارتا اسی کو مقتول کا ساز و سامان ملتا تھا۔

حضرت عمرؓ نے اپنے عہد میں فوج کا دفتر مرتب کرایا۔ اور بیت المال سے مجاہدین کی تنخواہیں مقرر کیں۔ طبقۂ اول میں اہل بدر تھے۔ جن کی تنخواہیں سالانہ پانچ ہزار درہم تھیں۔ حضرت عمرؓ بھی بدری تھے۔ اس لیے یہی تنخواہ ان کی بھی تھی۔ پھر شرکاء جنگ احد تھے۔ جو چار ہزار درہم پاتے تھے۔ اسی طرح درجہ بدرجہ کم ہوتے ہوتے معمولی سپاہی کی تنخواہ دو سو سے تین سو درہم تک سالانہ تھی۔ تنخواہوں میں اضافے بھی ہوتے تھے۔

مجاہدین کے اہل و عیال کی بھی تنخواہیں مقرر تھیں اور ان میں بھی مراتب کے لحاظ سے فرق تھا۔ البتہ غلام اور آقا میں کوئی فرق نہیں تھا۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے زمانے میں یہ اختلاف اٹھا دیا گیا۔ اور تمام مجاہدین کی تنخواہ خواہ وہ کسی طبقہ کے ہوں برابر کر دی گئی۔

عہد فاروقی میں دمشق حمص فلسطین عدن موصل فسطاط بصرہ اور کوفہ صدر فوجی مقامات قرار دیئے گئے۔ ان میں کثیر التعداد فوجیں رکھی جاتی تھی۔ نیز ان آٹھوں مقامات پر چار چار ہزار گھوڑے ہمیشہ تیار رہتے تھے۔ تاکہ فوری ضروریات پر رسالے مرتب ہو سکیں۔ سرحدوں خاص کر شام اور مصر کے سواحل پر حفاظت کے لیے فوجی دستے رہتے تھے۔ جو بیشتر اس نواح کے صدر مقام سے باری باری بھیجے جاتے تھے۔ سپاہیوں کو بقدر ضرورت سامان خوراک دیا جاتا تھا۔ اور چھاؤنیوں میں رسد کا ذخیرہ ہر وقت موجود رہتا تھا۔ فوج میں تمام عربی قبائل کے لوگوں کے نام درج تھے۔ ان کے علاوہ دیگر اقوام کے مسلمانوں کے نام بھی مندرج ہوتے تھے۔ ہر دس آدمیوں پر ایک عریف (جمعدار) رہتا تھا۔ جو ان کی شناخت رکھتا تھا اور ان کو تنخواہ دلاتا تھا۔

ہر سال تقریباً تیس ہزار جدید فوج بھرتی ہوتی تھی اور یہ سارا نظام اس قدر مرتب تھا کہ یہ ناممکن تھا کہ بہ وقتِ ضرورت کوئی شخص اپنے گھر بیٹھا رہے اور خلیفہ کو اس کا علم نہ ہو جائے۔

فوج کے ساتھ قاضی معلم ترجمان اور معالج وغیرہ بھی رکھے جاتے تھے۔ نیز راستہ بنانے اور پل باندھنے کا سامان بھی رہتا تھا کہ فوج سفر میں ہو تو جمعہ کے دن ضرور قیام کرے تاکہ لوگ تازہ دم ہو جائیں اور اپنے ہتھیاروں اور کپڑوں کو درست کر لیں۔ ہر روز صرف اتنی ہی مسافت طے کریں۔ کہ تھکاوٹ نہ ہو جائے۔ اُن سپاہیوں کو جو کسی مہم پر بھیجے جاتے تھے چار مہینے کے بعد گھر آنے کی رخصت ملتی تھی۔

حضرت عثمانؓ کے زمانے میں امیر معاویہؓ کے مشورے سے بحری فوج بھی تیار کی گئی۔ اور مسلمانوں کے پاس سمندر میں ایسی قوت ہو گئی کہ کئی بار رومیوں کو شکست دی اور قبرص وغیرہ فتح کر لیا۔

عرب میں جنگوں کا پرانا دستور یہ تھا کہ دشمن کے سامنے کبھی بے ترتیب اور کبھی صف بندی کر کے کھڑے ہو جاتے پھر دونوں طرف سے ایک ایک یا دُو دُو آدمی نکل کر لڑتے تھے۔ اس کے بعد عام حملہ کرتے تھے۔ چونکہ متمدن اقوام کے مقابلہ میں یہ طریقہ جنگ کار آمد نہ تھا۔ اس لیے حضرت خالدؓ روم و ایران کے اصول جنگ اور صف آرائی کو اچھی طرح سمجھ گئے تھے۔ اس لیے جنگ یرموک میں انہیں کی روش کے مطابق اپنی فوجوں کو مرتب کیا۔ اس وقت سے تمام اسلامی امراء انہی اصولوں پر فوجوں کو ترتیب دیتے تھے۔ سب سے پہلے مقدمہ لشکر ہوتا تھا۔ جو جنگ شروع کرتا تھا دائیں میمنہ بائیں میسرہ اور بیچ میں قلب جہاں سردار لشکر رہتا۔ پیچھے ساقہ ان میں سے بھی ہر ایک حصہ مختلف دستوں میں تقسیم رہتا تھا۔ اور ان کے ذمہ دار امراء ہوتے تھے جو سپہ سالار کے حکم کے مطابق اپنے دستے کو حرکت میں لاتے تھے۔ کوئی سپاہی اپنی صف سے آگے بڑھتا نہ پیچھے ہٹتا تھا۔

عربی امراء اپنے حد رجعت اور حفاظت کا خاص اہتمام رکھتے تھے۔ تاکہ دشمن پیچھے سے نہ آ پڑے اور جاسوسی کا انتظام اس قدر مکمل رکھتے تھے کہ غنیم کی کوئی بات چھپی ہوئی نہیں رہ سکتی تھی۔

محاصل

حضرت عمر کے عہد سے صیغۂ خراج کے عمال جداگانہ مقرر کئے جانے لگے۔ جو رقم وصول ہوتی تھی۔ اس سے فوج کی تنخواہ اور صوبہ کے اخراجات ادا کئے جاتے تھے۔ باقی دار الخلافت میں بھیج دی جاتی تھی۔ محصول کی دو قسمیں تھیں۔ مستقل اور غیر مستقل۔ مستقل آمدنی خراج و زکات اور جزیہ کی تھی اور غیر مستقل غنیمت اور عشور کی۔

خراج۔ اس زمین کے لگان کا نام ہے۔ جس کو مسلمانوں نے فتح کر کے خود وہاں کے باشندوں کے ہاتھ میں چھوڑ دیا ہو۔ یہ لگان اس زمین کے کرایہ کے طور پر لیا جاتا تھا۔ کبھی رقم معین کر دی جاتی تھی۔ اور کبھی پیداوار کا کوئی حصہ لے لیا جاتا تھا۔

زکوٰۃ۔ اس محصول کو کہتے ہیں جو مسلمانوں کی زمین مویشی یا نقدی وغیرہ پر لیا جاتا تھا۔ جس کی تصریح کتب فقہ میں کر دی گئی ہے۔ مسلمانوں کے پاس جو زمین ہوتی تھی۔ اس

پر عشر لیا جاتا تھا - یعنی ہر فصل کی پیداوار کا دسواں حصہ اور اگر خراجی زمین ان کے قبضے میں آ جاتی تھی تو اس پر ان سے وہی خراجی لگان لیا جاتا تھا۔

عہد فاروقی میں حضرت عثمان بن حنیف میں جو مساحت کے کام سے واقف تھے عراق کی پیمائش کے لیے بھیجے گئے۔ انہوں نے کل عراق کی پیمائش کی۔ حضرت عمرؓ نے تشخیص لگان میں خود عراقی کاشتکاروں سے مشورہ لے کر بہت خفیف شرح مقرر کی۔

جزیہ۔ یہ وہ رقم تھی جو ذمیوں سے لی جاتی تھی۔ یہ صرف ان مردوں سے وصول کی جاتی تھی جو بیس برس کی عمر سے پچاس برس کی عمر کے ہوتے ہوئے۔ بشرطیکہ وہ اپاہج اور معذور نہ ہوں۔ بوڑھے بچے اور عورتیں اس سے مستثنیٰ تھے۔ اس کی شرح ان اشخاص کی حالت کے مطابق رکھی جاتی تھی۔ زیادہ سے زیادہ فی کس ۴۸ درہم سالانہ اور کم سے کم ۱۲ درہم

حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں زکوٰۃ کا نکالنا خود مسلمانوں کے ذمہ کر دیا گیا۔ حالانکہ اس سے پہلے اس کی تحصیل کا کام خود امام ذمہ دار ہوتا تھا۔

عشور

مسلمان تاجر جب دوسری سلطنتوں میں اپنا مال لے جاتے تھے تو وہاں ان سے چنگی لی جاتی تھی۔ حضرت ابوموسیٰ اشعری نے اس کیفیت سے حضرت عمرؓ کو مطلع کیا۔ انہوں نے حکم دیا کہ جس حساب سے غیر سلطنتیں ہمارے تاجروں سے چنگی وصول کریں۔ اسی حساب کے تم ان تاجروں سے لو۔ لیکن دو سو درہم سے کم کے مال پر کچھ نہ لیا جائے۔

ایک بار قبیلہ بنی تغلب کا ایک نصرانی تاجر گھوڑا لے کر آیا۔ جس کی قیمت بیس ہزار درہم تھی۔ محکمہ کے نگراں نے اس سے ایک ہزار درہم چنگی لی۔ پھر اسی سال وہ دوبارہ اس گھوڑے کو لے کر گزرا تو انہوں نے پھر ایک ہزار درہم طلب کئے۔ تو اس نے کہا کہ ایک بار تو آپ اس کی چنگی لے چکے ہیں۔ اب ہر بار میں کہاں تک ادا کروں گا۔ مجبورہ ہو کر وہ حضرت عمرؓ کے پاس شکایت لایا تو انہوں نے جواب دیا کہ میں بندوبست کر دوں گا۔ ثعلبی نے اس کو ایک سرسری بات سمجھا اور دل میں کہا کہ اب شاید ایک ہزار درہم پھر دینا ہوں گے لیکن جس وقت سرحد پر آیا۔ تو وہاں خلیفہ کا حکم پہنچ چکا تھا۔ کہ جس چیز پر ایک بار عشور لیا جائے سال آئندہ کی اس تاریخ تک دوبارہ اس پر کچھ نہ لیا جائے۔ مسلمانوں کے مال تجارت پر چنگی بقدر زکوٰۃ کے رکھی گئی۔ یعنی چالیسواں حصہ ذمیوں پر اس سے دگنی اور اہل حرب پر دسواں حصہ۔

غنیمت۔ وہ مال ہے جو فوج کو دشمنوں سے حاصل ہوتا تھا۔ اس کے چار حصے فوج میں تقسیم کئے جاتے تھے اور ایک حصہ بیت المال میں آتا تھا۔ عہد فاروقی میں عراق سے دس کروڑ ۲۸ لاکھ درہم سالانہ کی آمدنی تھی اور مصر سے بارہ کروڑ درہم کی۔ حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں مصر کی وصولی میں دو کروڑ کا اضافہ ہو گیا تھا۔

ضروری اعلان

قاضی محمد زاہد الحسینی کا درس قرآن مجید گلبہار کالونی پشاور میں اس دفعہ بجائے ۷ فروری کے ۱۴ فروری کو ہوگا۔ شرکاء درس نوٹ فرمالیں۔

دعائے صحت

پربچیاں کلاں تحصیل نکودر کے دانشور بزرگ بابو نیاز محمد صاحب حال مقیم وہاڑی (ملتان) عرصہ دراز سے علیل چلے آ رہے ہیں۔ حال ہی میں بہاولپور اور نشتر ہسپتال (ملتان) میں زیر علاج رہے ہیں۔ قارئین خدام الدین سے التماس ہے کہ ان کی صحت عاجلہ، کاملہ کے لئے خصوصی دعا فرمائیں۔ (منظور سعید احمد)